پاکستان سے ہندوستان تک
مہندر ناتھ
مکتبہ سلطانی
بمبئی ۳

پاکستان سے ہندوستان تک

مہندر ناتھ

مکتبۂ سلطانی بمبئی ۳

طبع اوّل ـــــ مئی سنہ ۱۹۴۹ء

پرنٹر و پبلشر سلطان حسین مالک مکتبہ سلطانی نے سلطانی فائن ارٹ لیتھو
اینڈ پرنٹنگ پریس، واقع وزیر بلڈنگ بھنڈی بازار بمبئی ۳ میں چھپوا کر مکتبہ سلطانی بمبئی ۳ سے شائع کیا

اپنے بھائی کرشن چندر کے نام

مکتبۂ سُلطانی کی زیرِ طبع کتابیں

"۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۰ء تک کا بہترین ادب"

مرتبہ کرشن چندر

بڑا سائز، ضخامت چار سو صفحات سے اوپر قیمت ۸؍

"نئے زاویئے"

کرشن چندر

بڑا سائز: ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ قیمت ۶؍

"فسادی ادب"

عادل رشید

فسادات پر چیدہ چیدہ فنکاروں کی چیدہ کہانیاں،

ضخامت ۳۰۰ صفحات قیمت ۴؍

"ہم لوگ"

ترقی پسند ادبا و شعرا کے بارے میں انکے ساتھیوں کے لکھے ہوئے دلچسپ اسکیچ۔ ضخامت ۳۰۰ صفحات قیمت ۴؍

"جہاں میں رہتا ہوں"

مہندر ناتھ

کہانیوں کا مجموعہ۔ ضخامت ۲۵۰ صفحات قیمت ۳؍

اور

ان کتابوں کے علاوہ راجندر سنگھ بیدی۔ عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس سہیل عظیم آبادی، صدیقہ بیگم سیوہاروی اور دوسرے مصنفین کی کتابیں بھی چھپ رہی ہیں۔

فہرست

مقدمہ

ممتاز حسین

صفحات :— ۱۰

مہندر کے افسانوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

(۱) چاندی کے تار (۲) نئی بیماری۔

مہندر اب کسی تعارف کے محتاج نہیں رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی جگہ بنالی ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ میرے خیال میں مہندر کی بہترین کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں کچھ تو مہندر کے اگلے انداز کی کہانیاں ہیں۔ اور کچھ ایسی ہیں جو مہندر کے نئے سمت کو متعین کرتی ہیں۔ میں مہندر کی قوت اسی نئے سمت میں دیکھ رہا ہوں۔

مہندر نے اس نئی سمت کے دریافت کرنے میں کافی وقت لیا ہے وہ خود اپنے تجربوں سے اس منزل کی طرف بڑھا ہے۔ یہ سمت زندگی کی نامیہ طاقت کی عکاسی ہے۔ پہلے مہندر بھی ہمارے عام متوسط طبقے کے ادیبوں کی طرح

جنسیات کا شکار رہا ہے۔ نوجوانی کے دنوں میں یہی حقیقت اُسے ستاتی رہی۔ اپنے مختلف پہلوؤں کو اُس کے سامنے اُجاگر کرتی رہی۔ اس حقیقت کا ہر نقش حسین اور ہیبت ناک تھا۔ مہندر نے ان دونوں ہی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ مہندر کبھی بھی شدید قسم کی رومانیت میں ڈوبا نہ تھا۔ اُس نے اپنے کو کبھی بھی محبت کے نرم اور لطیف لے پر اپنے کو نہ بہنے نہیں دیا ہے۔ اُس نے ہر حسین صورت کو روک کر اُس کے اوپری غازے کو اُتارا ہے اور یہ پوچھا ہے۔ کیا تم واقعی خوش ہو۔ مہندر کا یہ رجحان بہت پُرانا ہے جب مہندر بمبئی میں فلمی دنیا سے متعارف ہوا۔ ڈائریکٹر، آرٹسٹ، ایکٹریس اور ایکٹرسوں سے ملا تو اسے اس اوپری آب تاب اور ظاہری جھجک کی حقیقت کا پتہ چلا۔ اُس نے ایکسٹرا لڑکیوں کی عصمت فروشی کے راز کو سمجھا۔ اُن کی دیوانگی، فریفتگی، حزن آمیز قہقہوں کے پیچھے شکست خوردہ شخصیت کا پتہ چلا لیا۔ اس حقیقت کا پورا مُرقع آپ کو "ایک دو تین" میں ملے گا۔ یہ تینوں جو دیکھنے میں الگ الگ ہیں اپنے جسم کے تقاضوں میں الگ ہیں اپنی روح کے کوب میں چھپی ہوئی ہیں ایک ہی حقیقت کی غمازی کرتی ہیں ہمیں فریب دیا گیا۔ ہمیں زندہ رہنے کے لئے عصمت بیچنے پر مجبور کیا گیا ہے۔

فن کار کو یہی حقیقت خود اپنی زندگی کی تلخی جانچنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ سماج کے ہر طبقے کے لوگوں کو دیکھتا ہے، اُسکے الگ الگ مشغلوں کا

جائزہ لیتا ہے۔ اپنی نگاہ کو مادّی لذتوں کے ہر نقش و نگار پر لوٹنے دیتا ہے، لیکن غمگین نگاہ کو تسکینِ جاں نہ پاتے ہوئے اس حقیقت تک بہت جلد پہنچ جاتا ہے۔ کہ وہ خود جس طبقے سے تعلق رکھتا ہے اقتصادی اعتبار سے موچیوں اور "بھیا" کے طبقوں سے الگ نہیں ہے۔ اسکی اپنی زندگی کی تمام تلخی اور ارد گرد کے ماحول کی تمام گندگی، غربت اور افلاس اُسی چراغ کا اندھیرا ہے جو ان کے سروں پر رکھ کر جلایا جاتا ہے۔ وہ سر اُٹھا کر ملابار کی زرق برق زندگی کو دیکھنا چاہتا ہے لیکن نہ تو چراغ ہٹتا ہے اور نہ وہ اپنا ہی سر اُٹھا پاتا ہے۔ جب یہ تلخی مہندر کے کام و دہن میں اور زیادہ رچ جاتی ہے تو وہ خالی "جیب" ہو کر اس حقیقت کو ذہنی طور پر ماننے کے لئے تیار ہو جاتا ہے کہ انسانیت کا مستقبل مزدوروں کے ہاتھ میں ہے۔

اس حقیقت تک پہنچنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ لیکن لطف تو جب ہے کہ فن کار خود اپنے تجربوں اور مشاہدوں کے ذریعے اس حقیقت تک پہنچے۔ مہندر نے ہوسناکی کی تمام منزلیں طے کی ہیں، بے شمار ایکٹرسوں پر فریفتہ ہوا ہے، کیک اور پیسٹری پر پھسلا ہے، وہسکی کی سرور آمیز کیفیتوں میں ڈوبا رہا ہے، انگریز، عیسائی، پارسی، ہندوستانی لڑکیوں کی عشق بازی کو غور سے دیکھتا رہا ہے لیکن خود اپنی زندگی میں ان چیزوں کا فقدان محسوس کرتا رہا۔ وہ لالچ سے بھری ہوئی بے خودی میں راہ گیروں سے ٹکرا بھی گیا ہے لیکن اُس نے

اپنی ذات کو ان نظر فریب مناظر میں کھونے نہیں دیا ہے۔ اُس نے سماجی زندگی کی افراتفری میں اس بنیادی تضاد کا پتہ چلا ہی لیا کہ یہ سب سرمایہ داری کا کیا دیا ہوا ہے اُس نے اپنی ذہنی اور جسمانی آسودگی کو ایک مرض میں تبدیل نہیں کیا۔ اُس نے فرائیڈ کے فلسفے کا سہارا نہیں لیا اور نہ اُس نے عریاں نگاری سے لذت ہی لینی چاہی۔ یہ بات مہندر کو جنسیات پر لکھنے والوں سے ممتاز کر دیتی ہے حالانکہ بعض موقعوں پر آپ کو ایسی عبارتیں ملیں گی جن میں اکتساب لذت کا شائبہ پایا جاتا ہے لیکن اختتام تک پہنچتے پہنچتے اس کیفیت کی نفی ہو جاتی ہے فطرتاً مہندر ناتھ رومانوی افتادِ طبع کا ـــ واقع ہوا ہے۔ وہ فلمی کہانیوں کی طرح رومانس اور محبت کا ایک پر ونے والا دھاگا اپنی ہر کہانی میں قائم رکھتا ہے لیکن اپنے تجزیے اور چیزوں کی جانچ میں اس قدر بے لاگ ہے کہ اُس کی رومانیت پاش پاش ہو جاتی ہے۔

"اس کی جیت" میں یہی کیفیت ملتی ہے، وہ ایک بھرپور رومانی فضا قائم کرتا ہے۔ اُسے تمام دنیاوی مصیبتوں سے الگ کر دیتا ہے۔ پھر یکایک ایک لاش دکھا کر اُن کے ذہن کو اس بُری طرح مجروح کر دیتا ہے کہ چاندنی رات کا خیمہ ٹوٹ کر گر پڑتا ہے۔

مہندر کے دل میں جو خارجی دنیا کو دیکھنے کی خواہش ہے۔ اپنی زندگی سے ہٹ کر جو دوسروں کی زندگی دیکھنے کی خواہش ہے اُسے اس بات پر مجبور کرتی رہی ہے کہ وہ سماجی زندگی کے حادثات کا بھی

جائزہ لے۔ مہندر نے اسی کوشش میں فساد کے عنوان کو بھی چھویا ہے، فساد کے موضوع پر ندامت مہندر کی پہلی کہانی ہے۔ یہاں مہندر کا رومانوی مزاج غالب ہے، فساد محبت کی راہ میں حائل ہو۔ فساد کے تباہ کن اثرات کے سامنے یہ ایک بڑی چھوٹی سی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ موضوع کے لحاظ سے یہ کہانی بھرپور نہیں ہے لیکن اس کی دوسری کہانی انسان کی لاش، پہلی کہانی کے مقابلے میں بہت زیادہ اچھی ہے۔ بملا اور استانی دونوں ہی مصیبت زدہ ہیں لیکن وہ اپنا ذہنی توازن نہیں کھوتی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہو کہ مصنف خود بھی اپنا ذہنی توازن نہیں کھوتا ہے۔ وہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی کو رہزن بتاتا ہے۔ دونوں ہی کے درمیان انسان کی لاش رکھ کر یہ چاہتا ہے کہ اس فساد میں نہ صرف ہندو اور مسلمان ہی مارے گئے ہیں بلکہ انسانیت کو بچانے والے بھی مارے گئے ہیں۔

مہندر نے اپنی تیسری کہانی کا موضوع یہیں سے لیا ہے "پاکستان سے ہندوستان تک" کا یہ موضوع یہ نہیں ہو کہ اس فساد میں کتنی حیوانیت اور بربریت کا مظاہرہ ہوا ہے، بلکہ یہ کہ بہت سے لوگوں نے اپنا ذہنی توازن، اپنی انسانیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔۔۔ سماج نے باعصمت عورتوں کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا گھر والوں نے ترکِ موالات کر دیا اور شوہر نے تو دھتکار کر نکال دیا۔ پھر بھی "پشپا" مستقبل کی روشنی کے سہارے ایک چٹان کی طرح

کھڑی رہی۔ اس کہانی میں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ صفدر اور پُشپا کے عشق کو پیش کرنا کہاں تک ضروری تھا۔ اس کو جاننے کیلئے مصنف کے نقطۂ نظر کو جاننا ضروری ہے۔ مہندر عشق کو پیش کر کے اس بات پر خاص طور سے زور دینا چاہتا ہے کہ صفدر کی انسانیت کی جانچ کڑی سے کڑی منزل میں کی جا سکے۔ صفدر کو پُشپا مل جاتی ہے۔ وہ اگر چاہتا تو اُسے رکھ لیتا اور اپنی دیرینہ محبت کے جذبے کو تسکین دیتا۔ لیکن اُس نے اس عظیم خواہش کو بھی انسانیت کے نام پر تج دیا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مہندر محبت میں زیادہ آئیڈیلسٹ نہیں ہے۔ ورنہ صفدر کی کشمکش کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ مہندر کی یہ کہانی بہت کامیاب کہانی ہے۔ مہندر نے اس کہانی میں انسانیت کی بُجھتی ہوئی شمع کو اپنے دامن میں بچایا ہے۔ فساد کے موضوع پر لکھنے والوں نے اس پہلو کو تقریباً بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے۔

اس کہانی کی کامیابی تو ایک طرف۔ مجھے مہندر کے بارے میں ایک اور حقیقت کا انکشاف ہوا۔ اگر مہندر آئیڈیلسٹ نہیں ہے تو وہ ارمان پرست بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ مہندر کے افسانوں میں رومانیت خود اُس کی اپنی رومانیت نہیں ہے بلکہ اسکے طبقے کے اس مطمحِ نظر کا نتیجہ ہے جو سنہرے موقعے تلاش کیا کرتا ہے یہ متوسط طبقہ اسی معنی میں کہنے کو تو رومان پرست ہے لیکن دراصل بڑا ہی حقیقت شناس ہے۔ مہندر اپنے اس طبقے کی خصوصیت کو

بڑی اچھی طرح جانتا ہے۔

مہندر کا افسانہ ہے "مجھے خرید لو" ۔ اس میں اس طبقے کے اخلاق عصمت اور عزت کی بنیاد کو بُری طرح بے نقاب کیا ہے۔ بالعموم لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ طبقہ اپنی قدروں کے بارے میں زیادہ قدامت پسند ہے لیکن مہندر نے تو اس حقیقت کی بھی پول کھول دی ہے۔ مہندر کی یہی حقیقت بیں نگاہ اسے یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ "فٹ پاتھ کی زندگی سے لے کر گھریلو زندگی تک وہی بے حسی، گندگی اور وہی بھوک ہے۔"

یہ ہیں مہندر کے افسانے جو آپ کی خدمت میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ مہندر اپنے فن کے ارتقائی دور میں ہے۔ اُس نے پہلے کے مقابلے میں بڑی ترقی کی ہے، اُس کا مشاہدہ اور تجربہ ہمہ گیر وسعتوں کا حامل ہو گیا ہے لیکن اُسے اپنے فن کو ذرا اور کسنے کی ضرورت ہے۔ موضوع کے انتخاب میں اور زیادہ وسعت دینے کی ضرورت ہے ـــــ یہ تو میرا مشورہ ہوا میری تنقیدی رائے یہ ہے کہ مہندر رومان پرست نہیں ہے بلکہ حقیقت نگار ہے ـــــ مہندر نے اپنی زندگی کے تجزیہ سے دوسروں کی زندگی کا پتہ چلایا ہے۔ اسی وجہ سے اُس کے بیان میں تلخی، شدت اور احساس ناسودگی ہے۔ وہ انسانیت کے باب میں رومان و محبت کی ہلکی پھلکی شعاعوں سے گذر کر طبقات کے

اقتصادی کس بل کو بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ نیا رجحان مہندر کو مزید دعوتِ فکر دے رہا ہے۔

ممتاز حسین

مجھے خرید لو

صفحات:- ۲۰

رات تاریک تھی، اندھیرا کافی بڑھ چکا تھا، دور۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی، صرف دھواں اور غبار پھیلا ہوا نظر آتا تھا، ہوا ٹھنڈی تھی۔ اور کانوں کو چیرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اُس نے اپنے کوٹ کے کالروں کو یکجا کیا، ناک کو رومال سے پونچھ کر، سردی سے ٹھٹھرتا ہوا، وہ آگے بڑھتا گیا، سڑک، اکیلی، خاموش اور سنسان تھی، دور۔ املی کے درختوں سے بہت دور، چاند، مضمحل، افسردہ اور بیمار سا دکھائی دیتا تھا، چاند کی بیمار کرنیں، اس دھوئیں اور غبار کو چیر کر زمین پر آنا چاہتی تھیں لیکن غبار اور دھواں اتنا گہرا تھا کہ وہ اپنی ناکامی اور شکست پر خود ہی پشیمان تھیں، آسمان نیلا اور شفاف تھا، اور تارے اپنی روشنی سے آسمان کو منور کر رہے تھے۔ قریب ہی سے ایک گورا سائیکل پر سیٹی بجاتا ہوا، اپنی محبوبہ کو اپنے ساتھ بٹھائے تیزی سے نکل گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، سائیکل سوار اندھیرے میں گم ہو چکا تھا،

صرف سیٹی کی آواز ہوا میں کانپ رہی تھی ——— اب وہ شہر کے اُس حصّے میں پہنچ گیا تھا، جہاں لاریاں —— تانگے، رکشائیں، موٹریں، بھاگتی ہوئی نظر آتی تھیں، مگر وہ ہاتھوں کو کوٹ کی جیبوں میں ڈالے ہوئے، خاموش اور اُداس چلا جا رہا تھا، بجلی کے قمقموں سے سڑک منوّر ہو چکی تھی، اور خدا کی مخلوق تیزی سے قدم اُٹھائے، بھاگی جا رہی تھی، سڑک کے دائیں طرف عالی شان عمارتیں کھڑی تھیں، رائل ہوٹل کی فلک بوس عمارت اپنا سر بلند کئے ہوئے راہگیروں کی طرف مُسکرا مُسکرا کر دیکھ رہی تھی، اور کہہ رہی تھی، —— کہ تم کتنے حقیر ہو، —— دُکانوں پر لوگ چیزیں خرید رہے تھے، ہر طرف گھما گھمی تھی، سڑک کی بائیں طرف پٹڑی تھی، اس پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے، انواع و اقسام کے لوگ، اُن کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے، اور اُنھوں نے میلی، گندی، بدبودار، رزائیاں اوڑھ رکھی تھیں اُن کی داڑھیاں اُلجھی ہوئیں، چہرے سیاہ اور داغ دار، آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں، پیٹ پھُولے ہوئے، سڑک پر لیٹے ہوئے باتیں کر رہے تھے، مردوں کے علاوہ عورتیں بھی تھیں، ان میں بہت سی عورتیں جوان تھیں، اور اگرچہ اُن عورتوں نے اپنے جسموں کے اردگرد میلی، چیکٹ، دھوتیاں لپیٹ رکھی تھیں لیکن دھوتیوں کے باوجود اُن کی رانیں ننگی نظر آ رہی تھیں، بعض عورتیں تو بہت بوڑھی تھیں، اُن کی ناکیں بیٹھی ہوئیں، ہاتھوں کی اُنگلیاں جھڑی ہوئیں بچّوں کو چمٹائے بیٹھی تھیں، یہ بچّے نہایت دُبلے پتلے تھے، ٹانگیں سُوکھی اور گندی، پیٹ پھُولے ہوئے، اور بالوں میں دنیا بھر کی دھول اور مٹی، وہ بار بار اپنی ماؤں کی طرف دیکھتے تھے، اور پھر سردی سے کانپ کر اپنے سُوکھے دُبلے پتلے جسموں کو سمیٹ کر آنکھیں بند کر لیتے تھے۔

اپنی ماؤں کی سوکھی، لٹکی ہوئی چھاتیوں سے چمٹ جاتے تھے،

پٹڑی پر ایسے لوگوں کے مختلف گروہ تھے، چند لوگوں نے سردی سے بچنے کے لئے آگ جلا رکھی تھی کئی گندے سے کالے، کالے برتنوں میں کھانے پکا رہے تھے، چولھوں کے گرد بیٹھے ہوئے آدمیوں کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جسم کا تمام خون آنکھوں میں عود کر آیا ہے، قریب ہی مونگ پھلی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ چند خوانچے والے باسی روٹیاں بیچتے ہوئے پیسے کا ایک، پیسے کا ایک کا نعرہ لگاتے مزے سے مونگ پھلی کھا رہے تھے۔ پٹڑی پر لوگوں نے جگہ جگہ پیشاب کر رکھا تھا۔ پیشاب کی بدبو سے دماغ متعفن ہو رہا تھا۔ لیکن پٹڑی پر رہنے والے لوگوں کو اس بدبو کا کچھ احساس نہ تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ متواتر اس ماحول میں رہ کر اُن کی سونگھنے کی حس مر چکی ہے، گندگی کے ایک بڑے ڈھیر کے قریب چند بچے کھڑے تھے، جو اس ڈھیر میں سے۔ کچھ بچی ہوئی ہڈیاں چن رہے تھے، وہ ان ہڈیوں کو اپنے گندے کپڑوں سے صاف کر کے، نہایت مزے سے چوسنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی زندگی کا یہی اندوختہ ہے، یہی بچی کھچی ہڈیاں، جو رائل ہوٹل کے مسافروں نے نہایت فیاضی سے پھینک دی تھیں ـــــ انسان بھی کتنا فیاض ہے اُس نے سوچا ـــ چند قدم کے فاصلے پر ایک ہجوم تھا، ـــ وہ بھی اس ہجوم میں شامل ہو گیا۔ اُس نے ایک آدمی کو زمین پر لیٹے ہوئے دیکھا۔ سر کے علاوہ اُس کا جسم ایک گندے سے کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ آدمی اس سڑک پر سردی سے ٹھٹھر کر مر گیا تھا، اور اس کے ارد گرد، اُس کے متعلقین اور رشتہ دار کھڑے تھے

یہ لوگ اپنے ساتھی کو دفنانا چاہتے تھے ، لیکن کفن کے بغیر دفنانا گناہ عظیم ہے۔ مذہبی کتابوں میں یہی لکھا ہے ۔۔۔۔ اور جو کچھ خدا کے پیارے بیچے ان کتابوں میں لکھ گئے ہیں ، اُن پر عمل نہ کرنا ، سیدھا جہنّم میں جانا ہے ، ۔۔۔۔ چند لوگوں نے اپنے اوور کوٹوں کی جیبوں میں سے پیسے نکال کر لاش کی طرف پھینک دیئے ۔ اور سروں کو جھٹکتے ہوئے آگے بڑھتے گئے ، ۔۔۔۔ اُس نے اپنی جیب ٹٹولی ،

اُس کے پاس کافی روپے تھے ، اگر وہ چاہتا ، تو کم از کم ایک روپیہ ضرور دے سکتا تھا مگر اُس نے سوچا کہ اس مرے ہوئے آدمی کو اب پیسوں کی ضرورت نہیں ، ضرورت تو اُس وقت تھی ، جب وہ زندہ تھا ، اُس وقت تو کسی شخص نے ترس کھا کر کچھ نہ دیا ، لیکن اب کہ وہ جنت کو جا رہا ہے ۔ لوگ جوق در جوق پیسوں کی بوچھاڑ کر رہے ہیں اب یہ کیا کرے گا پیسے لے کر ، لوگوں کی اس بے وقت فیاضی پر اُسے ہنسی آئی ہندوستان میں لوگوں کی قدر و منزلت اکثر موت کے بعد ہوا کرتی ہے ، ۔۔۔۔ اس خیال کے آتے ہی ، اُس نے ایک قہقہہ لگانا چاہا ، مگر اچانک اُسے خیال آیا کہ قریب ہی ایک لاش پڑی ہوئی ہے ۔ ایک انسان کی لاش ۔۔۔۔ جو اس دنیا میں کپڑے نہ ملنے کی وجہ سے مر گیا تھا ۔۔۔۔ اُسے ملوں ، اور بڑے بڑے پارچہ فروشوں کے سائن بورڈ نظر آنے لگے ۔ کپڑوں سے اَٹی ہوئی دُکانیں اُس کے ارد گرد طواف کرنے لگیں ۔۔۔۔ لیکن یہ لاش ۔۔۔۔ اُسے ان لوگوں پر غصہ آیا ۔ وہ سوچنے لگا ، یہ لوگ بغاوت کیوں نہیں کرتے ۔ وہ کیوں ان راہ گیروں کے کپڑے چھین کر پہن نہیں لیتے ۔ اس مونگ پھلی کے ڈھیر کو چٹ کیوں نہیں کر جاتے ، ۔۔۔۔ صرف پیسے کیوں جمع کرتے ہیں ، بھیک کیوں مانگتے ہیں ، راہ گیروں سے سطحی ہمدردی کے کیوں

طالب ہیں، لاش کے قریب اُس کے عزیز و اقارب گدھوں کی طرح گھیرے
دکھائی دیتے تھے، جن کی تیز اور بھوکی نگاہیں، مرے ہوئے بھائی پر نہ پڑتی تھیں بلکہ
اُن پیسوں پر، جو ٹھن ٹھن کرتے ہوئے، پتھریلی پٹڑی پر گر رہے تھے۔ وہ خوش تھے کہ
ایک انسان مر گیا ہے۔ وہ نوالا جو یہ انسان کھاتا تھا۔ اب وہ خود کھائیں گے، کیا
یہ لوگ اپنے ہی بھائی کے گوشت پوست کے بھوکے تھے، اور جو پیسہ اُس لاش پر
گرتا تھا، اُنہی کے جسم کا ایک ٹکڑا تھا۔ زندگی کتنی بھیانک ہے، اُس نے سوچا۔ وہ
سوکھے، گندے، جھوٹے ٹکڑے کھانے کے عادی ہو گئے تھے اُسے ان لوگوں کی
حالت پہ بے حد غصہ آیا، اُس نے روپیہ جیب میں ڈالا، اور وہ آگے بڑھتا گیا۔ ان
حالات کو دیکھ کر اُس کے دل کی اُداسی اور بڑھ گئی، چاروں طرف اندھیرا موت کی
سیاہی کی طرح پھیل رہا تھا۔ صرف بجلی کے قمقمے بجھتی ہوئی اُمیدوں کی طرح
ٹمٹما رہے تھے۔ اُس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا

وہ آج کی رات اپنے کلدیپ سے ضرور ملے گا۔ وہی اس تاریک اور بھیانک
رات میں اُسے راحت اور سکون بخش سکتا ہے، اُسے کلدیپ سے ملے ہوئے قریباً
دو سال ہو گئے تھے وہ اُسے دیکھ کر خوشی اور مسرت سے جھوم اُٹھے گا۔ اُس نے اپنے
نیلے سوٹ پر نگاہ ڈالی، کتنا زیب دیتا تھا یہ سوٹ اُسے۔ اُس نے جیب سے سگرٹ
نکالا، اور سلگایا، اُس کے دل کی اُداسی سگرٹ کے دھوئیں میں تحلیل ہوتی ہوئی نظر
آئی، قریب ہی سے ایک تانگہ گذر گیا۔ تانگے میں ایک امریکن اور اُس کی محبوبہ، دونوں
ٹانگوں سے ٹانگیں ملائے، ہاتھوں میں ہاتھ رکھے، ہوا میں اُڑے جا رہے تھے۔ جہاں

ٹھٹھرتی ہوئی، گوری لڑکی کی زلفوں کو چومتی ہوئی بل کھاتی ہوئی بھاگ رہی تھی تھوڑی
دور جاکر امریکن نے اپنی محبوبہ کو ——— توانا بازوؤں میں جکڑ لیا، اور امریکن کا
چہرہ، اپنی محبوبہ کے رخساروں پر جھک گیا زندگی اتنی بری نہیں، اُس نے سوچا اور سگرٹ
کا کش لگایا. سگرٹ کا دھواں پھیپھڑوں تک چلا گیا. اور اُس کی آنکھوں میں
آنسو آ گئے ——— وہ برآمدے میں پہنچ چکا تھا، وہ زور سے کھانسا. اُس کا
دوست کلدیپ سامنے کھڑا تھا. کلدیپ اُس کے سینے سے لگ گیا.

دو سال کے بعد وہ اپنے دوست سے ملا تھا، چونکہ وہ ایک بڑے
شہر سے چھوٹے شہر میں وارد ہوا تھا، اس لئے لوگوں کے دلوں میں اس کی وقعت
بڑھ گئی تھی. جس شخص نے اُس سے پوچھا کہ وہ کیا کماتا ہے، وہ کہاں رہتا ہے اُس نے
نہایت ایمانداری سے اپنی تنخواہ چار سو روپے بتائی. اپنی عالی شان کوٹھی کے
چرچے کئے اور قسم قسم کی لڑکیوں سے اپنے معاشقے سنائے، لوگ یہ سُن کر متعجب
ہو گئے. انھوں نے اُس کی دعوتیں کیں، چائے پر بلایا، اُس کی ذہانت اور ذکاوت
کی تعریف کی، ——— چند سال قبل، ان ہی لوگوں نے اس کی بے عزتی کی تھی،
اُس کی ذہانت کا مضحکہ اُڑایا تھا، اُس کے افسانوں کو نہایت گھٹیا بتایا تھا لیکن
اب چار سو روپوں کا ذکر سُن کر انھیں اپنے پُرانے نظریے بدلنے پڑے، اُس کی
خامیاں اب خوبیاں بن گئیں. یار دوستوں کے دلوں میں حسد کی آگ جلنے لگی
اُس کے دوست، اُس کے واقف، اُس کی مالی حالت کی بہتری کی خبر سُن کر
خوش نہیں ہوئے، بلکہ رنجیدہ ہوئے، دل میں جلتے رہے، کُڑھتے رہے، اور
وہ خوش تھا، یہ سب کچھ جان کر ———

لیکن کلدیپ اُس کا پُرانا اور جگری دوست تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، کہ وہ اپنے دوست سے کیا کہے۔ کچھ جواب نہ پاکر وہ سگرٹ کے کش لگانے لگا، اتنے میں کلدیپ کی بیوی آگئی۔ اُسے دیکھتے ہی وہ کہنے لگی۔ "جی آپ تو بڑے آدمی بن گئے ہیں نا، اب تو ہمارے گھر آتے ہی نہیں، ـــــــ آپ کا انتظار کرتے کرتے ہماری آنکھیں پک گئیں، ـــــ کیا ہوا اگر ہم غریب آدمی ہیں، اور ہماری تنخواہ تھوڑی ہے ـــــ وہ دوست ہی کیا۔ جو تکلیف میں کام نہ آئے، یہ کہہ کر اُس نے اپنا دوسرا بچہ اُس کی گود میں رکھ دیا

"اچھا۔ تو یہ دوسری غلطی ہے آپ کی؛ اُس نے بچے کو تھپکتے ہوئے کہا

کلدیپ دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پہلے سے کافی موٹا ہو گیا تھا بچپن میں وہ خاصا خوبصورت تھا، لیکن جُوں جُوں وہ جوان ہوتا گیا ـــ زیادہ موٹا اور بدصورت ہوتا گیا۔

"کہو۔ کیا حال ہے، میری جان"۔ اُس نے نہایت بے تکلفی سے کلدیپ سے پوچھا۔

"بھئی میرا جی تو اس شہر سے اُکتا گیا ہے، جی چاہتا ہے، یہاں سے بھاگ جاؤں۔ کیا کلکتے میں میرے لئے کوئی نوکری نہیں؟" کلدیپ نے سوالیہ انداز میں اُس سے کہا۔

"یہاں تمھیں کیا تکلیف ہے، اپنی سرکار کے دفتر میں نوکر ہو، بیس سال نوکری کرنے کے بعد تمھیں پنشن ملے گی، ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو تمھیں باقاعدہ تنخواہ مل جاتی ہے۔ رہنے کے لئے سرکاری کوارٹر ملا ہوا ہے۔ اور تمھیں کیا چاہیئے"

"خاک تنخواہ ملتی ہے"۔ کلدیپ کی بیوی جل کر اُٹھی، اُس کی بھویں ایک ایک کھنچ گئیں۔ اور آنکھیں سُرخ ہو گئیں ۔۔ جب سے دفتر میں نوکر ہوئے ہیں، ترقی بالکل نہیں ملی، جنگ چھڑتے ہی ساٹھ روپوں پر کلرک بھرتی ہو گئے تھے، اب انھیں نوکر ہوئے پانچ برس ہو گئے ہیں، صرف پندرہ روپے ترقی ہوئی ہے۔ ان کے ساتھی، بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ چکے ہیں۔ چار چار پانچ پانچ سو روپے ماہوار کماتے ہیں۔ اور یہ ہیں کہ ابھی تک پچھتّر روپوں پر ہی قناعت کر رہے ہیں! پہلے تو گزارہ ہو جاتا تھا ۔۔۔ اُن دنوں ہم دونوں تھے، نئی نئی شادی ہوئی تھی' زندگی کتنی خوشگوار تھی۔ اُن دنوں اتنی گرانی بھی نہ تھی، اب تو ہر چیز پر کنٹرول ہو گیا ہے لیکن پھر بھی چیزیں نہیں ملتیں، پچھتر روپوں سے کیا بنتا ہے، چھ مہینے سے ایک فلم بھی نہیں دیکھی۔ پہلے ایک لڑکی تھی۔ اب دوسری پیدا ہو گئی ہے، پیٹ بھرنا اب اتنا آسان نہیں، ۔۔ آپ ہمیں کلکتے کیوں نہیں لے چلتے ۔۔ سچ مچ یہاں سے جی اُکتا گیا ہے'

اور وہ دیر تک کلدیپ کی طرف دیکھتا رہا۔ کلدیپ خاموش تھا بجلی کے کھمبے کی طرح ۔۔ کلدیپ کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے ۔۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو۔ تم جانتے ہو میری حالت ۔۔ میرا باپ انجنیر تھا وہ آٹھ سو روپے ماہوار کماتا تھا، کیا وہ دن تمھیں یاد ہیں، جب ہم کوٹھی میں رہتے تھے۔ ہر طرف نوکر چاکر تھے طرح طرح کی چیزیں کھانے کو ملتی تھیں، گوشت اور انڈے بافراط تھے، اب چھ ماہ سے میں نے انڈوں کی شکل نہیں دیکھی۔ ان دنوں ہر روز پھل کھاتے تھے۔ وہ کون سی چیز تھی، جو ہمیں میسّر نہ تھی، باپ نے بی اے تک

پڑھادیا اور شادی بھی کردی، جو کچھ میرا باپ کر سکتا تھا اُس نے کیا۔ زندگی نے وفا نہ کی۔ اور وہ جلد مر گیا ——— لیکن میں پھر بھی خوش تھا میں اُن دنوں دفتر میں نیا نیا ملازم ہوا تھا۔ اور مجھے اپنی بیوی پسند تھی، ——— تم نے اُسے شادی سے پہلے نہیں دیکھا ——— شاید نہیں میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتا۔ کتنے خوبصورت اور چمکیلے تھے اُس کے بال۔ کتنی حسین تھیں اُس کی آنکھیں ——— اور جب آنکھوں میں کاجل لگاتی تھی، تو آنکھوں کی موہنی اور سندرتا دوبالا ہو جاتی تھی، اور جب آنکھیں جھپک کر میری طرف دیکھتی، تو پلکوں کے سنگھم کو چومنے کے لئے میں بے قرار ہو جاتا۔ لیکن اُن دنوں یہ کنواری تھی، اور جب کبھی باہر سیر کرنے جاتی؛ ——— تو اس کی چھوٹی بہن اُس کے ساتھ ہوتی ——— جوانی کی حدت سے اُس کے گالوں کی رنگت ارغوانی ہو جاتی ——— بالوں میں سورج کا سونا جذب ہو جاتا۔ اور سنہری گھنے بالوں کا جال میری آنکھوں کے سامنے رقص کرتا۔ لیکن آنکھیں تو اب بھی خوبصورت ہیں ——— مگر بالوں کی چمک غائب ہو گئی ہے سورج کا سونا نہ جانے کدھر اُڑ گیا۔ خوبصورت چمکتے ہوئے ہونٹ، جو لعلِ احمریں کو شرماتے تھے۔ اب سوکھ کر نیلے ہو گئے۔ گال اندر پچک گئے ہیں ——— اب میری بیوی مجھے گالیاں دیتی ہے اور میں بیوی کی گالیاں نہایت صبر سے سنتا ہوں، اُس کی گھڑکیاں اور گالیاں میرے سینے میں خنجر کی طرح چبھتی ہیں، جس نے کبھی باپ تک کی گالی برداشت نہ کی ہو۔ اور باپ گالی بھی کب دیتا تھا۔ وہی آج بیوی کی گالیاں نہایت خاموشی سے سنتا ہے، اور صرف اسی اُمید پہ کہ شاید زندگی کی خزاں میں پھر سے بہار آجائے ——— اور میری بیوی مجھے گالیاں نہ دے تو

کیا کرے، وہ بھی تو سچی ہے، وہ کہتی ہے کہ شادی سے پہلے وہ کتنی صحت مند تھی۔ اُس کی رانیں اور پنڈلیاں کتنی سڈول اور توانا تھیں، اُس کی آنکھوں میں کتنی چمک تھی، اُس کے بال کیسے سنہری اور لانبے تھے اُس کی مسکراہٹ میں کتنی دل فریبی تھی، اُس کی آواز میں کتنی مٹھاس تھی —— اب تم ہی بتاؤ یہ چیزیں کیوں فنا ہو گئیں۔ کیا ان باتوں کا میں قصور وار ہوں، میں تو نہایت ایمان داری اور شرافت سے زندگی گزارنا چاہتا ہوں —— میں نے کبھی کسی کلرک کی چغلی نہیں کھائی، کبھی کسی دوست کو دھوکا نہیں دیا۔ کبھی کسی سے بُرا مذاق نہیں کیا —— کیا میں نے کبھی کہا کہ میں ایک عالی شان کوٹھی بنانا چاہتا ہوں۔ نوکروں کی ایک پلٹن رکھنا چاہتا ہوں، یا بنک میں ہزاروں روپے جمع کرانا چاہتا ہوں، یا باغوں، زمینوں، دُکانوں، اور مُربّعوں کا مالک بننا چاہتا ہوں، یا اپنے بھائی کی جائداد پر قبضہ کرنا چاہتا ہوں —— میں تو صرف اپنی بیوی کی خوبصورت آنکھوں کو پسند کرتا ہوں، مجھے اپنے بچوں سے محبت ہے۔ میں خود نہ کھا کر انھیں کھلاتا ہوں، انھیں دودھ پلاتا ہوں، آج کل دودھ کس قدر مہنگا ہے، یہ تو تم جانتے ہی ہو —— لیکن یہ خوشیاں بھی چھن گئیں، —— اور پھر کلدیپ نے بلند آواز میں کہا —— کس شخص کو حق ہے، کہ میرے بچّے کے مُنھ سے نوالہ چھین لے، کس شخص کو حق ہے کہ وہ میری بیوی کی مسکراہٹ ہتھیا لے، اُس کے تبسّم کو پامال کر دے اُس کی جسمانی خوبصورتی کو فنا کر دے، میری زندگی کو اُجاڑ دے، میرے گھر کو برباد کر دے ——

یہاں کلدیپ کی آواز بھرّا گئی۔ اور وہ مری ہوئی آواز میں کہنے لگا —— اب جی چاہتا ہے کہ استعفٰی دے دوں گھبراتا ہوں، سوچتا ہوں کہ میں بھوکا رہ سکتا

ہوں، میری بیوی بھوکی رہ سکتی ہے لیکن ان معصوم بچوں پر کیا گذرے گی، یہ کس طرح فاقے کریں گے۔ اسی خیال سے ایک جونک کی طرح نوکری سے چپکا ہوا ہوں۔ تمھیں اپنی قسم مجھے یہاں سے لے چلو۔"

اپنے دوست کی باتیں سُن کر اُس کا گلا بھر گیا۔ اور وہ بولا، میں نے زندگی میں بہت کچھ سیکھا ہے، یہ دنیا۔ تمھارے ایسے شریف النفس انسانوں کے لئے نہیں ــــ پہلے میں دیانت دار تھا، اب مکار ہوں، پہلے سچ بولتا تھا، اب جھوٹ بولتا ہوں پہلے خاموش رہتا تھا، اب بہت باتیں کرتا ہوں، ہر وقت گپیں ہانکتا رہتا ہوں، پہلے خود دار تھا، اب چاپلوس ہوں، پہلے ہر انسان کی عزت کرتا تھا، اب ہر انسان کی پگڑی اُچھالتا ہوں، ــــ اور اسی لئے کافی روپے کما۔تا ہوں، ــــ میں چار سو روپے ماہوار کماتا ہوں، اُس نے رعب سے کہا۔

"چار سو روپے"۔ کلدیپ کی بیوی نے اُس کی طرف متعجب نگاہوں سے دیکھا، جیسے وہ عجائب گھر میں کسی قیمتی چیز کی طرف دیکھ رہی ہو، کلدیپ کی بیوی کی نگاہوں میں اُس کی قدر و منزلت بڑھ گئی، جیسے وہ اپنے خاوند سے کہہ رہی ہو۔ دو سال قبل تمھارا دوست کچھ نہ کماتا تھا۔ تمھارے گھر پر روز آتا تھا، کئی بار اُس نے تمھارے گھر کھانا کھایا۔ کئی بار اُس نے اپنی شکستوں اور ناکامیوں کا رونا رویا، کئی بار اُس نے روپے اُدھار لئے، جو آج تک واپس نہ کئے ــــ اب دیکھ لو۔ جی بھر کر دیکھ لو۔ چار سو روپے ماہوار کماتا ہے، ــــ تم تو نِرے بُدھو ہو، لوگوں سے ملتے بھی نہیں، تم کسی سے کچھ بھی نہیں کہتے۔ صرف بچے پیدا کرنے پر تُلے ہوئے ہو۔"

"آپ کیا کام کرتے ہیں"، کلدیپ کی بیوی نے پوچھا۔

"جی — میں — میں۔ فلمی کہانیاں لکھتا ہوں، افسانے بیچتا ہوں، ریڈیائی ڈرامے لکھتا ہوں، فلموں کے لئے مکالمے لکھتا ہوں — چار سو روپوں کے علاوہ اور بھی کماتا ہوں، اور اب سوچ رہا ہوں کہ ایکٹر بن جاؤں — آج کل ایک ایکٹر ہزاروں روپے کماتا ہے، مزے سے عیش کرتا ہے — میں ہر ایکٹر کو جانتا ہوں، بہت سی ایکٹرسوں سے مل چکا ہوں"

"کیا ایکٹرسیں واقعی چاند سی خوبصورت ہوتی ہیں، اُس نے کَن انکھیوں سے اُس کی طرف مُسکراتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں" وہ صاف جھوٹ بول رہا تھا۔

"ایک ایکٹرس کتنا کماتی ہے؟"

"ایک ہزار سے لے کر دس ہزار ماہوار تک"

یہ سُن کر کلدیپ کی بیوی اپنی طرف دیکھنے لگی — کیا میں — کیا — میں — ایکٹرس نہیں بن سکتی، — لیکن پھر اُسے خیال آیا — مگر اب کیا ہو سکتا ہے، شادی سے پہلے میں خوبصورت تھی، آپ نے شاید میرے بال نہیں دیکھے کتنے گھنے اور ریشمیں تھے۔ اُس نے اپنے جُوڑے پر ہاتھ پھیرا۔ اور پھر سر ہلا دیا — اب ان آنکھوں کے نیچے گڑھے پڑ چکے ہیں، مگر یہی آنکھیں ایک دن آفت کا پرکالہ تھیں، ان آنکھوں کو دیکھنے کے لئے آپ کے دوست ترستے تھے، جب گلی سے گزرتی تھی، نوٹرکے شعر پڑھتے تھے، آوازے کستے تھے — اُن دنوں مجھے ایکٹرسوں سے نفرت تھی میں ایک شریف اور دیانت دار انسان کی بیوی

بننا چاہتی تھی، اور مجھے واقعی ایک شریف اور دیانت دار کلرک مل گیا۔ مجھے یہ کافی پسند تھے۔ پہلے یہ کچھ پتلے اور چھریرے سے تھے، اب تو کافی موٹے ہو گئے ہیں توند بڑھ گئی ہے، کئی بار کہہ چکی ہوں، ورزش کیا کرو، مگر نہیں مانتے۔ اب تو گال بھی پھول کر کُپا ہو گئے ہیں۔ چلتے ہیں تو عجیب بے ہنگم سی چال۔ اپنی صحت اور جسمانی دلکشی کا انھیں کوئی خیال نہیں، صرف بچوں کے آگے پیچھے پھرتے رہتے ہیں، یہ بڑی بچی تو ان کے ساتھ سوتی ہے، ——— پھر بھی مجھے پسند ہیں، مگر زندگی میں دلکشی نہیں دلفریبی نہیں، خوشی نہیں، ——— اب بھی آموں کے بُور کی خوشبو آتی ہے۔ اور آکاش اُسی طرح شفاف اور نیلا ہے، اب بھی دھوپ اُسی طرح چمکتی ہے۔ اب بھی گھاس ہری اور سرسبز ہوتی ہے ——— مگر اب یہ چیزیں اچھی نہیں لگتیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے روپوں کی اشد ضرورت ہے، اور میں نے سوچ لیا ہے کہ اپنی لڑکیوں کی کبھی شادی نہ کروں گی انھیں پڑھا لکھاؤں گی لیکن شادی کے لئے کبھی نہ کہوں گی، صاف کہہ دوں گی ایکٹرس بن جاؤ۔ ہزاروں روپے کماؤ ——— اور عیش کرو ——— مجھے اس زندگی سے نفرت ہو گئی ہے، وہ زندگی بھی کیا جس میں پیٹ بھر کر کھانا نہ ملے، وہ زندگی بھی کیا۔ جہاں عورت کی ساری خوبصورتی اور رعنائی فنا ہو جائے ——— ایک لمحہ کے لئے کامل سکوت ہو گیا۔

پھر یک بارگی دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں چمکیں۔ جیسے وہ کہہ رہی ہوں؛ کیا میں ایکٹرس نہیں بن سکتی ——— کیا تم ——— مجھے۔ صرف مجھے۔ اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے ۔ ۔ ۔"

اُف۔ وہ متزلزل نگاہیں، —— جیسے کسی آتش فشاں پہاڑ کا دہانہ پھٹ گیا ہو —— جس کے شعلوں نے بیوی اور شوہر کے تمام نازک رشتوں کو خاک سیاہ کر دیا —— وہ نگاہیں، جنھوں نے پرانی قیود، پرانے رسم و رواج، مروّجہ اخلاق، الدین کی عزت اور توقیر، عورت کی عصمت اور باقی تمام قدروں کو آگ کے شعلوں کے سپرد کر رہا ہو، —— وہ نگاہیں۔ جو صاف کہہ رہی ہوں۔ کہ محبت بھی روپے کے بغیر نہیں پنپ سکتی۔ وہ نگاہیں —— جنھوں نے عصمت اور عزت کے لبادے کو اُتار پھینکا ہو اور ننگی ہو کر کہہ رہی ہوں —— ہمیں خرید لو۔ ہمیں خرید لو۔ ہمیں خرید لو —— ان آنکھوں کی کیا قیمت ہو گی۔ ان نرم ریشمیں بالوں کا کیا دو گے! یہ مُتناسب پنڈلیاں۔ یہ دہکتے ہوئے گال۔ یہ جسم کی دلکش قوس، —— ان سب کی کیا قیمت ہو گی۔

اُس دن اُسے معلوم ہوا کہ عصمت، عزت اور مُروّجہ اخلاق کا خول کتنا نرم و نازک ہوتا ہے، ایک ہی اقتصادی جھٹکے سے یہ خول ایک غبارے کی طرح ایک دم پھٹ جاتا ہے۔

اور وہ سب کچھ دیکھ کر سُن کر برداشت نہ کر سکا، —— وہ اپنے دوست کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اپنی نوزائیدہ بچی کو پیار کر رہا تھا۔ دوسری بچی ماں کی گود میں تھی، —— اور وہ سوچ رہا تھا کہ زندگیوں میں کس طرح نفرت کا جذبہ سرایت کرتا ہے، صرف کسی چھوٹی سی بات پر —— صرف اقتصادی حالت کے بگڑنے پر عصمت اور اخلاق کی زنجیریں کس طرح ٹوٹ جاتی ہیں، اُسے محسوس ہوا کہ فٹ پاتھ

کی زندگی سے لے کر گھریلو زندگی تک دبی بے حسی، وہ بے گانگی وہی بھوک ہے۔ اور وہ یہ کہنا چاہتا تھا۔ اپنے دوست کی بیوی سے ـــــ کہ وہ اس قسم کی باتیں نہ سوچے ـــــ وہ اُس بڑے شہر میں جا کر کیا کرے گی۔ وہ اس قسم کی باتیں کیوں سوچتی ہے، یہ خیالات اُس کے دماغ میں کس طرح گھس گئے۔ دو سال پہلے اُس نے اس قسم کی باتیں نہ سوچیں لیکن اب کیوں ـــــ

"میں اس لئے یہاں نہیں آیا کہ اپنے دوست کی بیوی کو گمراہ کروں، اگرچہ میں اخلاقی قدروں کا پابند نہیں، میں روایات کا قائل نہیں، مگر میں عورت کی عصمت کو نگینے کی طرح بازار میں بیچنا نہیں چاہتا اور نہ اُسے سلاسل میں جکڑنا چاہتا ہوں، لیکن میں انسانیت کا ضرور قائل ہوں ـــــ میں تمھیں یہاں سے اُٹھا کر کہاں لے جا سکتا ہوں، ـــــ اور پھر تم اب ایسی خوبصورت بھی نہیں رہیں۔ مانا کہ کبھی تھیں ـــــ یہ منحوس خیال تمھیں کیوں آیا۔ کیا تمھیں اپنے شوہر پر رحم نہیں آتا ـــــ وہ تمھاری ہر ادا پر جان دیتا ہے، وہ تمھاری دل شکنی نہیں کرتا۔ تمھاری ہر جائز و ناجائز خواہش کو پورا کرنا چاہتا ہے، لیکن میں ایک آوارہ شخص ہوں، یوں ہی چلتا پھرتا یہاں آگیا ہوں ـــــ میں اپنی بیوی کو کبھی اپنے آپ پر حاوی نہ ہونے دوں گا میں اُس کی باتیں نہ مانوں گا ـــــ میں اُس کی بے جا خواہش کو ٹھکرا دوں گا، ـــــ اور پھر بھی اُس سے پوری اطاعت کا طلب گار رہوں گا۔

میرے چار سو روپوں کا نام سُن کر پھسل نہ جاؤ۔ یہ پھسلن اچھی نہیں۔ اِن چار سو روپوں میں زہر ہے، اتنی تلخی ہے کہ تم برداشت نہ کر سکو گی،

—— اور میں کتنا کماتا ہوں، کیا کماتا ہوں، اسی پر تو تمھاری محبت کا انحصار ہوگا —— ایسی محبت کی بنیاد دیرپا ثابت نہیں ہوتی —— میں جانتا ہوں، تمھاری زندگی میں ایک ناقابلِ بیان تلخی ہے، تم زندگی کے لوازم حاصل نہیں کرسکتیں، لیکن تمھیں ایک ایسے مرد کا قرب حاصل ہے، جو پھر تمھیں کبھی نہ ملے گا —— مجھے اپنے دوست کی حالت پر رحم آتا ہے —— میں جانتا ہوں، تم اسی کے ساتھ خوش رہ سکوگی، —— گھبرانے سے کچھ نہ ہوگا، —— شاید اُسے ترقی مل جائے۔ پھر سوچو۔ تمھاری زندگی خوشگوار ہوجائے گی۔ یہ تلخیاں مٹ جائیں گی اور مسرت کے چشمے پھوٹ نکلیں گے —— کیوں ——

اور وہ اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں اپنی معصوم بچّی کے چہرے پر جھک گئیں۔ شاید ندامت کے بوجھ سے۔ اور وہ فرطِ محبّت سے بچّی کا چاند سا چہرہ چُومنے لگی۔

رات اسی طرح مضمحل اور افسردہ نظر آتی تھی، اندھیرا کافی گہرا ہو چکا تھا، ہوا سرد اور یخ بستہ تھی، دُھواں اور غبار اسی طرح پھیلا ہوا تھا، بجلی کے قمقمے اس اُداس اور ٹھنڈی ہوا میں پیلے اور زرد دکھائی دیتے تھے، —— دُور املی کے درختوں کے پیچھے چاند ندامت کے بوجھ سے جُھکا ہوا اُداس اور خاموش کھڑا تھا، —— چاند کی ٹھنڈی برفیلی کرنیں آہستہ آہستہ بکھر رہی تھیں، اکیلی، اُداس اور خاموش جیسے آہیں بھر رہی ہوں ——

ہر طرف کامل سکوت اور سناٹا تھا ـــــــ مکان اس موت جیسی خاموشی میں اُداس اور اکیلے کھڑے تھے ۔ بالکل الگ تھلگ اُس نے کوٹ کے کالروں کو ٹھیک جاکیا، اور نکٹائی کی گرہ کو درست کرتے ہوئے زیرِ لب کہا :-

"کلدیپ کی بیوی کو شاید یہ بھی معلوم نہیں، کہ میں کچھ بھی نہیں کماتا ظاہری توقیر برقرار رکھنے کے لئے میں نیا سوٹ پہن کر آیا تھا۔ مگر یہ سُوٹ بھی تو میرا اپنا نہ تھا، بلکہ کسی دوست سے مانگ کر لایا تھا۔ ـــــ

دُور ایک کُتّا بھونکا۔ اُس کے خیالات کا سلسلہ ٹُوٹ گیا ـــــــ اور وہ اکیلی سڑک پر اکیلا چلتا گیا ۔

ایک۔ دو۔ تین۔ چار

صفحات :- ۳۰

رات کا وقت تھا۔ بجلی کا قمقمہ کمرے کو منور کئے ہوئے تھا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا لیکن اس چھوٹے سے کمرے میں چیزیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں، صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا۔ ایک چھوٹی سی میز تھی، جس کے اردگرد تین لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اور اُن کے ساتھ ایک مرد بھی تشریف فرما تھا۔ میز پر شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی اور چار گلاس، اور فرش پر سوڈے کی بوتلیں ـــــ اُس نے زندگی میں خود شراب کم پی تھی۔ اُس نے اُس ماحول میں جنم لیا تھا، جہاں شراب اور طوائف کو بُری نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن آج وہ ہر قسم کا گناہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ آج جو لڑکیاں اُس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں، وہ بازار کی رنڈیاں تھیں۔ وہ شراب پیتی تھیں۔ گانجا پیتی تھیں، اور جب شراب زیادہ پی لیتی تھیں، تو عجیب و غریب باتیں کرتی

تھیں۔ اُن میں ایک کا نام رسیا تھا، دوسری کا نام سلطانہ، تیسری کا نام ایلین۔
ایک ہندو تھی، دوسری مسلمان اور تیسری کرسچین۔ ان تینوں میں ایلین خوبصورت
تھی، ایلین کو اُس نے پہلی بار اس محفل میں دیکھا تھا۔ ایلین ابھی تک خوبصورت
تھی۔ اُسے بتایا گیا تھا، کہ وہ عالمِ شباب میں بہت شوخ و شنگ تھی۔ عالمِ
شباب سے مطلب یہ ہے، جب وہ کنواری تھی۔ جب تک کسی غیر شخص نے
اُس کے جسم کو ہاتھ تک نہ لگایا تھا۔ شباب اُس کے جسم سے پھُوٹتا تھا، کپڑے
اُس کے جسم پر پھنس کر آتے تھے۔ شروع میں وہ اکسٹرا میں کام کرتی تھی۔
جب کبھی کسی فلم میں اچھے کلوز اَپ کی ضرورت ہوتی، تو ایلین کو بُلایا جاتا۔ اور
امین پھُدکتی، ناچتی، اِٹھلاتی، بل کھاتی سٹوڈیو میں چلی جاتی، کلوز اَپ دے کر،
گھر میں آتی —— لیکن ایلین آج خاموش تھی۔ رسیلا نے امین کی طرف
مُسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا: شرما رہی ہو، گلاسوں میں شراب کیوں نہیں
ڈالتیں، جلدی کرو۔

ایلین نے شراب کی بوتل اُٹھائی، اور چار گلاسوں میں شراب ڈالی،
چار گلاسوں میں شراب پورے مقدار کی ڈالی گئی تھی۔ ہاتھ خود ہی پیمانہ بن کر
رہ گیا تھا۔ مرد نے اس بات کو محسوس کیا۔ کہ ایلین زندگی میں پہلی بار شراب
نہیں پی رہی ہے، بلکہ کئی بار پی چکی ہے، جبھی تو اُس کا ہاتھ ترازو کی طرح کام
کر رہا ہے،

شراب ڈالنے کے بعد، سوڈے کی بوتلیں کھولی گئیں۔ اور تھوڑا تھوڑا
سوڈا گلاسوں میں ڈالا گیا۔

چاروں نے گلاس اُٹھائے۔ گلاس ٹکرائے۔ اور سب گلاسوں کو مُنہ لگا لیا گیا۔

آہستہ آہستہ شراب جسم میں رچنے لگی، آنکھوں میں سرور آنے لگا۔ آنکھوں کی پُتلیاں چمکنے لگی، گالوں کی حدت بڑھنے لگی۔ ذہن میں ایک لطافت سی آگئی۔ جسم میں گرمی کا احساس ہونے لگا۔ سب سے پہلے رسیا نے گلاس ختم کیا۔ اُس نے کسی سے پوچھے بغیر بوتل سے شراب اپنے گلاس میں اُنڈیل لی۔ سوڈا ڈالا۔ اور بڑے مزے سے ہنسنے لگی۔ وہ رسیا کو کافی مدت سے جانتا تھا۔ رسیا کی عمر ہوگی چوبیس برس ــــ رسیا تو اس گھر میں رہ چکی تھی۔ اسی کمرے میں، اس لئے وہ اُس کی عادات، حرکات اور سکنات سے پوری طرح آگاہ تھا۔ وہ رسیا کے خدوخال دیکھ کر کہہ سکتا ہے۔ کہ وہ عالم شباب میں واقعی ایک ایک آفت ہوگی، اگر آفت نہ ہوتی، تو اُس کا یہ حشر نہ ہوتا۔ رسیا نے بیٹھے ہوئے مرد کی طرف دیکھا، اور کہنے لگی۔ "تم بہت کم پیتے ہو، اور اگر پیتے ہو۔ تو بہت کم باتیں کرتے ہو۔ لیکن جب میں پی لیتی ہوں تو بہت باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ایلین، دوسرا پیگ لونا۔ اور تم سلطانہ۔ تم۔ اسی طرح بیٹھی ہو۔ جیسے مُردے کو دفن کرکے آئی ہو۔ اور کمار جی، (مرد کی طرف اشارہ کر کے)، مرد بڑے حرامزادے ہوتے ہیں۔ کم از کم مجھے تو ان پر کوئی اعتبار نہیں، میری عمر تیرہ سال کی تھی۔ جب میں نے فلم کمپنیوں کے ارد گرد چکر لگانے شروع کئے، پونا میں ایک فلم کمپنی میں نوکر ہو گئی، پچاس روپے ماہوار پر، کمار جی، اُن دنوں آپ نے مجھے نہیں دیکھا، میرے کہنے کا یہ مطلب ہے۔ کہ میں اُن دنوں کافی خوبصورت تھی۔

گیا اب بدن اور چہرے کا رنگ سیاہ ہو چکا ہے، لیکن میرا رنگ کچھ کچھ سفید تھا
آنکھیں موٹی موٹی۔ اور میں اتنی موٹی نہ تھی، چھریرا بدن تھا۔ بلکہ نئی نویلی گائے
کی طرح، معصوم اور پیاری۔ اُن دنوں مجھے ہر چیز اچھی لگتی تھی۔ یہ چاند تارے،
نیلا آسمان، ہری ہری گھاس، اور میں بالوں میں بڑے اچھے اچھے پھول لگایا
کرتی تھی۔ اور کانوں میں بُندوں کی جگہ، چنبیلی کی کلیاں لگایا کرتی تھی۔ گو میرا
لباس سادہ ہوتا تھا۔ یہی چار پانچ روپے والی ساڑھی پہن کر آیا کرتی تھی، ہر روز
نہاتی تھی۔ اور صبح جب نہا دھو کر، اور ایک سفید ساڑھی پہن کر سٹوڈیو میں آتی،
تو اکسٹرا سے لے کر ہیرو تک سب میری طرف دیکھتے، اور آوازے کستے تھے،
اور کم بخت بنواری تو ہمیشہ ٹوٹی ہوئی موٹر کے مڈگارڈ پر بیٹھ کر کہتا، 'ہائے جانی'
دانت بھینچ کر چھاتی پر ہاتھ مارتا۔ اور جب میں اُس کے قریب سے گذرتی، تو
نہایت بھاری آواز میں وہ شعر پڑھنے لگتا، وہ شعر مجھے یاد نہیں رہے۔ اچھے
خاصے فارسی کے شعر ہوتے تھے۔ بنواری کو آپ نے نہیں دیکھا۔ تقریباً ۶ فٹ
کا جوان تھا۔ ذات کا براہمن تھا۔ آواز — بھاری، جیسے لاری کا بھونپو، جسم
گھٹا ہوا اور بھرا ہوا۔ چہرے کی ہڈیاں سخت۔ ہاتھ مضبوط اور توانا۔ اور مجھے تو
اُس کے سر کے بال بہت پسند تھے، نہایت ہی کھردرے اور سخت۔ کتنا
بھی تیل اُن بالوں میں ڈالو، لیکن اُن بالوں میں مانگ نہ نکل سکتی تھی، ہمیشہ
بچھوؤں کے ڈنک کی طرح ٹیڑھے رہتے تھے! کمارجی، بنواری کا سینہ
پتھر کی طرح سخت ہوتا تھا، اور کمبخت باتیں بہت کرتا تھا، سٹوڈیو میں کوئی عورت
نظر آجائے۔ اُس پر پھبتی کسے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ اور سبھی لڑکیاں اُس کی باتیں سن کر

خاموش ہو جاتی تھیں، کون اس ہٹے کٹے مشٹنڈے سے لڑائی مول لے۔۔
ایک بار اُس نے بے رحم عاشق کا رول کیا۔ ڈائرکٹر نے اُس کا سر مُنڈوا دیا۔ اُس کے گھنگریلے بالوں پر قینچی پھیر دی۔ اُس دن میں رات بھر روتی رہی۔ اُس کے بالوں کو دوپٹے میں رکھ کر رات بھر سسکیاں لیتی رہی،۔ کہنے لگا۔ رسیا۔ گھبراتی کیوں ہو، یہ بال پھر آجائیں گے۔ رومت۔ میری جان۔ چار مہینے کے بعد، سر پر ایک گھنا جنگل اُگ آئے گا؛ تو ہاں یہ بعد کی باتیں ہیں۔ میرا اور اُس کا معاشقہ بھی عجیب قسم کا تھا، وہ شام میں کبھی نہیں بھول سکتی، جب میری اور اُس کی محبت کا آغاز ہوا تھا۔ میں اکثر شام کے چھ بجے اپنے گھر جاتی تھی، ایک شام کیا دیکھتی ہوں، کہ بنواری راستے میں کھڑا ہے، کہنے لگا، رسیا، ادھر آؤ'۔

میں نے کہا۔ 'کیوں'۔

کہنے لگا 'ہم حکم دیتے ہیں'۔

'ہم تمھارا حکم نہیں مانتے، میں نے چڑ کر کہا۔

وہ میری طرف لپکا، اور مجھے اپنے طاقت ور بازوؤں میں اُٹھا کر قریب ہی کے مکان میں لے گیا، جس کمرے میں وہ لے گیا، اُس میں اندھیرا تھا۔ بنواری نے زور سے مجھے چارپائی پر پھینکا۔ اور ساتھ ہی چلّایا، "سالی چپکے سے بستر پر لیٹی رہ، اگر چلّائی، تو جان سے مار دوں گا"۔

"جان سے مار دے گا، بڑا آیا تیس مار خاں"۔ میں چلّائی۔

"تو مجھے سمجھتی کیا ہے"۔ وہ میرے قریب آکر بولا۔ اُس نے میرا چہرہ زبردستی اپنے سخت ہاتھوں میں لے لیا، اور میرا مُنہ خوب چُوما۔

"حرامزادہ کہیں کا۔" میں نے گالی بکی۔

"گالی بکتی ہے سور کی بچی۔ اچھا میں تمھیں ابھی مزا چکھاتا ہوں،" اور اُس نے مجھے اپنے آہنی بازوؤں میں لے لیا، اور اپنے سینے سے اتنے زور سے بھینچا، کہ میرا سانس رُکنے لگا۔ "اُلو کی پٹھی۔ اگر چاہوں تو چُوم چوم کر تمھارا ملیدہ کر دوں۔ چُپکے سے یہاں بیٹھی رہ، اور جو کچھ کہتا جاؤں، کرتی جا۔ کل کی الکسٹرا اور لگی نخرے کرنے،، ان بازوؤں کی طرف دیکھ ۔۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے دائیں بازو کی مچھلی پر رکھا۔ دیکھ،، لے، اگر ذرا بھی چُوں چرا کی، تو جان نکال دوں گا۔ زبان کھینچ لوں گا۔ اور اس کھڑکی سے دھکا دے کر باہر پھینک دونگا اور اگر پھر بھی نہ مانے گی، تو دیکھ یہ چاقو۔" بنواری نے اپنی جیب سے چاقو نکالا، "دیکھ اس کی دھار۔ کرا دھر ہاتھ۔ دیکھ کتنا تیز ہے یہ چاقو، پیٹ میں بھونکدونگا اور پھر تمھارے جسم کو کاٹ کاٹ کر، ٹرنک میں ڈال کر، نہر میں پھینک دونگا، رسیا، میں تم سے سچ کہتا ہوں، مجھے تم سے بے انداز محبت ہے، جس دن تمھیں دیکھا تھا، میری دائیں آنکھ پھڑکتی تھی، اُسی دن میں نے سمجھ لیا تھا۔ کہ میرا اور تمھارا معاملہ ہو جائے گا۔ اور آج دیکھ لو۔ وہی ہو کر رہا۔"

"شرم نہیں آتی تمھیں بنواری۔ اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے۔"

"کیوں۔"

"مجھے تم سے بالکل محبت نہیں۔" میں نے غصے میں آکر کہا۔

"تو ہو جائے گی۔"

"جب دیکھا جائے گا۔"

"مجھے معلوم ہے ہو جائے گی، محبت ہمیشہ آہستہ آہستہ ہوتی ہے،
ایک دن میں نہیں ہوتی۔" اور اُس نے میرا دایاں بازو زور سے پکڑ لیا۔
"بنواری زور سے نہ دبا۔ میری اُنگلیاں ٹوٹ جائیں گی۔"
"کانچ کی بنی ہوئی ہیں نا۔" اُس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔
"تمھیں قسم اپنی ماں کی۔"
"میری ماں کب کی مر گئی ہے"، اُس نے رُوکھے لہجے میں کہا۔
"تمھیں قسم اپنے بھائی کی۔"
"میں تو اکلوتا بچہ تھا اپنی ماں کا۔"
"تمھیں قسم اپنے باپ کی۔"
"اُس سالے نے دوسری شادی کر لی ہے۔"
"تمھیں قسم اپنی بیوی کی۔"
"وہ تو تمھیں بتاؤں گا۔" یہ کہہ کر اُس نے قہقہہ لگایا۔
اور میں نے بائیں ہاتھ سے اُس کے منہ پر زور سے طمانچہ مارا ___
طمانچہ لگتے ہی وہ میری طرف تیر کی طرح لپکا۔ میں بہتیرا چیختی رہی، چلّاتی رہی،
لیکن اُس نے میرے دوپٹے سے میری ٹانگیں چارپائی سے باندھ دیں۔ اور
اُسی سے میرے سینے کو چارپائی سے باندھ دیا۔ میں نے ہاتھوں سے اُس کو
مارنا شروع کیا۔ لیکن وہ ایک جن کی طرح مجھ سے لپٹا رہا۔ اور میرے رخساروں
میرے ہونٹوں کو چومتا رہا۔ آخر جب میں تھک ہار گئی، تو وہ زبردستی میرے
ساتھ سو گیا۔

"یہ میرے سہاگ کی پہلی رات تھی۔ !

پہلی رات، ___ دوسری رات ___ تیسری رات۔ رسیا بنواری کی متوالی ہوگئی۔ کمارجی، مرد بڑے حرامزادے ہوتے ہیں، شراب کا ایک پیگ دینا۔"

کمارجی نے رسیا کو شراب کا ایک اور پیگ دیا۔ اور رسیا نے ایک ہی بار گلاس کو منھ لگا، اور گلاس کو خالی کر کے میز پر رکھا۔

"رسیا بنواری کی ہوگئی، نہ شادی ہوئی نہ بیاہ، ___ لیکن بنواری جو کچھ کہتا تھا۔ وہ میں مانتی تھی، میں کمپنی میں نوکر تھی، اس لئے میں نے کبھی بنواری سے روپے نہ مانگے۔ اور اُس حرامزادے کا یہ حال تھا۔ کہ اُس نے ایک بار بھی مجھے، ساڑھی خرید کر نہ دی۔ ہاں کبھی کبھار وہ مجھے سنیما لے جاتا تھا لیکن کبھی کوئی جمپر یا قمیض کا کپڑا۔ یا کوئی چپل، خرید کر نہ دی، وہ میرے گھر کبھی نہ آیا میں اُس کے کمرے میں جاتی تھی۔ ہر شام جاتی تھی۔ ایک بار حمل ہوگیا تھا اُس نے دوائی دے کر حمل گرا دیا تھا۔ لیکن اس دو سال کے عرصے میں، کبھی اُس نے شادی کے لئے مجھے نہ کہا، ہاں اکثر وہ مجھے بار بار کہتا تھا۔" دیکھ رسیا۔ اگر کبھی تو نے کسی دوسرے لونڈے سے عشق کیا، تو جان سے مار دوں گا۔" اور میں اُس سے بہت ڈرتی تھی !۔ چھ فٹ کا جوان تھا۔ کیا پتہ، کس دن جوش میں آکر میرا بازو مروڑ دے، میری گردن توڑ دے، میری ٹانگ زخمی کر دے لیکن اس ڈر کے علاوہ مجھے اُس سے محبت ہوگئی تھی۔ اگر کسی شام میں اُس کے کمرے میں نہ جاتی، تو رات بھر نہ سو سکتی۔ دن کو تو سٹوڈیو میں ملتی تھی، اور ہم

دونوں ادھر اُدھر گپیں ہانک لیا کرتے تھے، اور وہ ہمیشہ مجھے "ہائے جانی" کہکر پکارتا، مجھے دیکھ کر اپنا سینہ کوٹتا، اور باقی ایکٹروں کے سامنے، مجھ سے گندے گندے مذاق کرتا، لیکن ان باتوں کے باوجود وہ مجھے اچھا لگتا تھا، اُس کا ۶ فٹ قد، اُس کی بھاری آواز، اُس کا مجھ پر رعب جماتا۔ اور کبھی کبھی جوش میں آکر مجھے پیٹتا، یہ سب باتیں مجھے یاد ہیں، اور بہت اچھی طرح یاد ہیں،۔ اور ایک دن میری اور اُس کی لڑائی ہوگئی، بالکل ایک چھوٹی سی بات تھی،۔ اُن دنوں، ایک لڑکی، جس کا نام کملا تھا، وہ نئی نئی، سٹوڈیو میں آئی، اور بنواری نے اُس سے بھی اسی قسم کے مذاق شروع کر دیئے، کملا کا رنگ بالکل سیاہ تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت نہ تھی، لیکن معلوم نہیں۔ بنواری کی نگاہوں میں وہ کس طرح چڑھ گئی، لگا اُس کے آگے پیچھے گھومنے، اور مجھے یہ باتیں اچھی نہ لگتی تھیں، میں نے اُسے سو بار ٹوکا۔ اور کہا۔ "دیکھ بنواری۔ اگر تم نے اس حرام زادی سے عشق کیا، تو میں بھی دوسرے لونڈے سے عشق کروں گی۔"

میری بات سُن کر وہ ہنس پڑا۔ اور ہنستے ہنستے، اُس نے میرا بازو زور سے مروڑا۔ اور میری چیخ نکل گئی، اور اُس کے بعد کہنے لگا۔ "جس دن تم دوسرے مرد کے پاس سوئیں، میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

اُن دنوں سٹوڈیو میں ایک نیا ہیرو آیا، نام تھا۔ کیلاش!۔ بالکل تمہارے ایسا، کمار جی۔ وہ مجھے اکثر گھور گھور کر دیکھتا تھا۔ ایک دن اُس نے مجھ سے کہا۔ "تمہارا بنواری کملا کو اپنے کمرے میں لے گیا ہے۔۔ میں نے یہ فقرہ سُنا۔ تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں سیدھی، اُس کے کمرے کی طرف بھاگی، اور

جب کمرے کے قریب پہنچی، تو دیکھا، کمرہ اندر سے بند تھا، اور اندر سے سسکیوں کی آواز آرہی تھی، اور بنواری گرج رہا تھا۔" سالی۔ اگر منہ سے ایک لفظ نکالا، تو اس چاقو سے بوٹی بوٹی نوچ لوں گا، گردن کاٹ دوں گا۔ اور ایک ایک انگ کاٹ کر، ٹرنک میں ڈال کر کسی دریا، یا نہر میں پھینک دوں گا۔ چپکے سے بستر پر لیٹی رہ۔ اور جو کچھ کہوں، کرتی جا۔" اور اس کے بعد سسکیوں کی آوازیں بند ہوگئیں۔ اور میں وہاں سے واپس آگئی۔

دوسرے دن کیلاش ملا!

وہ مسکرایا۔

اور میں بھی مسکرائی۔

اس نے مجھے گھر بلایا۔

میں بلاحیل وحجت چلی گئی، مجھے بنواری سے نفرت ہوگئی تھی، جی چاہتا تھا۔ کہ سر بازار اس کو جوتیاں ماروں، سٹوڈیو میں اسے گالیاں دوں لیکن سوچ بچار کر میں نے انتقام کا یہ طریقہ نکالا۔ میں کیلاش کے ساتھ سوگئی۔ اس قصے کا بنواری کو علم ہوگیا وہ اسی دن مجھے زبردستی اپنے گھر لے گیا۔ اور مجھے خوب مارا۔ جوتیوں سے میرے سر کی مرمت کی۔ اتنا مارا۔ کہ میرے منہ سے خون بہ نکلا۔ معلوم نہیں، اس نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ نہیں تو اس دن وہ مجھے مار کر ہی دم لیتا۔

پیٹنے کے بعد کہنے لگا۔" نکل جا، یہاں سے۔ فوراً یہاں سے نکل جا۔ دوبارہ اس گھر میں نہ آئیو۔" اور اس کے بعد اس نے مجھے بہت گالیاں دیں،

اور دھکّے دے کر گھر سے نکال دیا،

وہ شام بہت بُری شام تھی کمارجی! اُس دن میں رنڈی بن گئی تھی۔ بنواری نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ گھر کی یہ حالت تھی کہ باپ کچھ نہ کماتا تھا۔ دن رات گانجا پیتا۔ اور میری تنخواہ سے جو پیسے بچتے اُس کی شراب پی لیتا۔ ایک بنواری کا سہارا تھا۔ وہ بھی ٹوٹ گیا۔ کمارجی، ایک بات تو بتا دو، مرد غیر عورت کے پاس سوئے تو کیا یہ گناہ نہیں، اور بیچاری عورت غصّے میں اگر کسی غیر مرد کے پاس سو جائے، تو وہ رنڈی ہو گئی، بے غیرت ہو گئی، بے ایمان ہو گئی، بے وفا ہو گئی۔ کیا مردوں سے وفا کی اُمید کی جا سکتی ہے؟ لیکن مرد تو حرام زادے ہوتے ہیں کمارجی! اور اُس کے بعد میری خوابگاہ میں کئی بنواری آئے، اور کئی گئے۔ اس جسم نے کئی مردوں کو راحت بخشی ان ہونٹوں نے کئی مردوں کی پیاس بجھائی، لیکن کمارجی، میں اصلی بنواری کو نہ بھول سکی۔

اب بھی جب کبھی وہ میرے سامنے آتا ہے، تو سارے جسم میں ایک جھرجھری سی آجاتی ہے۔ ابھی —— اُس دن مجھے راستے میں مل گیا۔ وہی چھ فٹ کا قد، وہی گھنگریلے بال، وہی موٹی بھاری آواز۔ مجھے دیکھ کر ٹھہر گیا۔ اور کہنے لگا۔ 'سالی کمینی کہیں کی۔ اگر کیلاش کے پاس نہ سوتی، تو آج تو میرے پاس ہوتی۔ میں تمہیں سونے کے ہار سے لدا کر دیتا۔ کیوں۔ ٹھیک ہے نا —— کسی چیز کی ضرورت ہو، تو بتانا ——' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کمارجی، میں اُسے بتانا

چاہتی تھی، کہ حرامزادے، اگر تو اُس کالی کلوٹی چھوکری کے پاس نہ سوتا، تو رسیا آج رنڈی نہ ہوتی۔ وہ ساری عمر تمھاری غلام رہتی ــــ لیکن سچ بات ہے کمار جی۔ کہ میں بنواری کو بھلا نہیں سکتی۔ اس زندگی کے موڑ پر کتنے اجنبی آئے، کتنوں نے دوست بننے کی کوشش کی، کتنوں نے داشتہ بنانا چاہا لیکن رسیا بنواری کی تھی، اُس کی ہو کر رہے گی!۔ یہ دل صرف بنواری کا ہے، اور باقی جسم، ہر شخص کا ہے، جو دام دے، خریدے۔ ــــ"

یہ کہکر رسیا خاموش ہو گئی، اور اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

بجلی کا قمقمہ اُسی طرح روشن تھا۔ باہر گپ اندھیرا تھا۔ اور اندر ایک میز کے گرد تین عورتیں اور ایک مرد شراب پی رہے تھے۔

سلطانہ کہنے لگی۔ "کمار جی!۔ رسیا کو اور شراب نہ دینا۔ نہیں تو پینے کا سارا مزا جاتا رہے گا۔ یہ حرامزادی جب زیادہ پی لیتی ہے، تو رونے لگتی ہے! ــــ اب رونے دھونے سے کیا بنتا ہے۔ اُس وقت بنواری سے دل نہ لگاتی، لیکن دل تو عجیب شے ہے۔ کمار جی۔ آپ تو پیتے بھی ہیں اور جب پی لیتے ہیں، تو بالکل خاموش ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب میں پیتی ہوں، تو گذرے ہوئے واقعات، فلم کی ریل کی طرح آنکھوں کے سامنے چھا جاتے ہیں۔ میں تو اسی محلے میں بڑھی اور جوان ہوئی۔ جب میں جوان ہوئی۔ تو باپ نے دوسری شادی کر لی، اور ماں بچاری، تو اپاہج تھی۔ چلنے پھرنے سے عاری! ــــ کمانا تو مجھے ہی پڑتا تھا، اُن دنوں میں ایک صاحب کے

ہاں کام کرتی تھی، برتن صاف کرتی تھی، اُس کے کمروں کو صاف کرتی تھی ۔ ۔
کھانا پکاتی تھی ۔ کمارجی، ساتھ والی بلڈنگ میں رہتی تھی میں، ـــــ بڑا ہی
شریف آدمی تھا وہ ۔ اُس نے کبھی آنکھ اُٹھا کر میری طرف نہ دیکھا، فلوٹ
بجایا کرتا تھا؛ اور اُس کی بیوی نہایت چڑچڑے دماغ کی عورت تھی، ذرا
ذرا سی بات پر چڑ جایا کرتی تھی ۔ درصل تھی وہ بدصورت ۔ اسی لئے بابوجی،
اور اُس کی بیوی کی آپس میں بالکل نہ بنتی تھی ۔ وہ صبح کھانا کھا کر گھر سے نکل جاتا
اور شام کو واپس آجاتا ۔ اور کھانا کھا کر علیحدہ کمرے میں سو جاتا ۔ جب کبھی وہ
گھر میں بیٹھ کر فلوٹ بجاتا تو ایک عجیب سماں بندھ جاتا ۔ محلے کے سب بچے
اُس کے کمرے میں آجاتے، اور چپکے سے، خاموشی سے، اُس کا گیت
سُنتے ۔ کمارجی، تم اُس کا فلوٹ سُنتے، تو واقعی تمہارا جی خوش ہو جاتا ۔

اُن دنوں میں جوان تھی ! ـــــ جوان تو اب بھی ہوں لیکن اُن دنوں
اور ان دنوں میں بہت فرق ہے، اُن دنوں جب میں فلوٹ سُنا کرتی تھی، تو
عجیب قسم کی اُداسی دل و دماغ پر چھا جاتی تھی ۔ اور کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا
تھا، کمارجی کہ میں جنگل میں اکیلی ہوں، اور دُور ـــــ دُور ـــــ مجھے کوئی آدمی
اپنے پاس بلا رہا ہے ! ـــــ لیکن وہ آدمی میرے قریب نہیں آتا ـــــ میں
گھنٹوں اکیلی، اُس جنگل میں بیٹھی ہوئی ہوں، اور اُس آدمی کا انتظار کر رہی ہوں؛
ـــــ لیکن وہ دُور ـــــ بیٹھا ہوا ہے، اور میرے نزدیک نہیں آتا ـــــ
لیکن اس اُداسی کے علاوہ مجھے اُن دنوں دھوپ اچھی لگتی تھی، دن اچھا لگتا
تھا، رات اچھی لگتی تھی ۔ یہ مرد اچھے لگتے تھے، صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اچھی

اُن دنوں میرے سر کے بال بہت لمبے تھے، سر سے لے کر پاؤں تک چھا جاتے تھے۔ بڑی مشکل سے کنگھی کر سکتی تھی، لیکن جب کنگھی کرتی تھی، تو بڑا لطف آتا تھا، میٹھی میٹھی حسین سی سرسراہٹ، ذہن میں محسوس ہوتی تھی۔ کمارجی، اُن دنوں میرا بدن، چھریرا تھا، اور جب میں اکیلی نہاتی تھی، تو کئی منٹ تک میں اپنے جسم کو دیکھتی رہتی تھی، اور کبھی اپنا جسم دیکھتے دیکھتے، میری کہنیاں جلنے لگتیں، سارا جسم گرمی سے جلنے لگتا، اور سانس زور زور سے آنے لگتا ۔ میں پھر آہستہ آہستہ ٹھنڈا پانی اپنے جسم پر ڈالتی۔ ٹھنڈا پانی، گرم گرم جسم پر پڑتا اور ایک عجیب خوشی کا احساس ہوتا — اب اُن دنوں زندگی عجیب تھی، کوئی مسکرا کر دیکھتا۔ تو انگ کا رُواں رُواں کھلکھلا اُٹھتا! — کمار جی! گو میں اَن پڑھ ہوں، لیکن مجھے اچھے آدمیوں سے ملنے کا شوق ہے، اچھے کپڑے پہننے کا شوق ہے، اچھی زندگی بسر کرنے کا شوق ہے، — اُن دنوں اسی بازار میں ایک بنیا رہتا تھا۔ ایک دن کہنے لگا:۔

"سلطانہ، کیوں زندگی خراب کر رہی ہو، میرے گھر میں رہو، تو دودھ مکھن کھلا کر پری بنا دوں گا"

میں نے موٹے بنئیے کی طرف دیکھا، مُسکرائی اور آگے چل دی۔ اور بنئیے کی دوکان کے سامنے دادا گرجو رہتا تھا — ابھی تک وہیں رہتا ہے، اب تو بچارے کی بہت ہی بُری حالت ہے، دن رات ایک ٹوٹی چارپائی پر پڑا رہتا ہے، سُوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے! کمار جی، اُس وقت تم گرجو کو دیکھتے، تو تمھیں معلوم ہو جاتا، کہ وہ کس ٹھاٹھ سے رہتا تھا، تین کاریں تھیں

اُس کے پاس !۔ چار کوٹھیاں، ایک شیواجی پارک میں، ایک مالابار ہل میں؛ ایک فلیٹ مارین لائن پر، اور ایک ماہم میں ——

اور گھر میں عورتوں کا جمگھٹا رہتا تھا، شراب اور تاش، انہی چیزوں پر زندہ تھا وہ —— ایک بار گرجو نے راستہ میں مجھے پکڑ لیا، اور کہنے لگا۔ "بیوقوف کی بچی، اپنی صورت دیکھ ۔کیوں زندگی برباد کر رہی ہے میرے گھر چلی آ— رانی بنا کر رکھوں گا۔ جو جی میں آئے کھانا، جس قسم کے کپڑے مانگو گی، وہی دونگا بس تمہارا ایک اشارہ کافی ہے میرے گھر آجاؤ۔ اور ایک بیٹ رانی کی طرح رہو۔"

اور میں نے دادا گرجو کی بات نہ مانی، —— دادا گرجو سٹہ کھیلتے تھے یعنی سٹہ کے لئے اُنھوں نے ایک مکان رکھ چھوڑا تھا۔ وہاں اُس کے چیلے چانٹے رہتے تھے۔ اس علاقے میں دادا گرجو کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھ سکتا تھا، پولیس والے اُس کے واقف تھے، وہ اُنھیں روپے دیا کرتا تھا گھر بُلا کر شراب پلایا کرتا تھا، اور حسین رنڈیوں کے ساتھ سُلایا کرتا تھا۔ ایک دو بار پولیس والوں نے اُسے بُلا کر پوچھا، "کہ تم اتنی کاریں کہاں سے لائے ہو؟" بچارا کیا جواب دیتا۔ پولیس والوں نے اُسے صاف کہدیا، کہ "میاں اگر جیل میں نہیں جانا چاہتے ہو تو کوئی دوکان کھول لو، باہر ایک بورڈ لگا دو، اور ایک فرم فلوٹ کرلو، بس پھر کوئی نہ پوچھے گا۔ اُس کے بعد چاہے، تم لڑکیوں کو گھر میں رکھ کر رنڈی بازی کراؤ، یا لوگوں کو شراب پلاؤ۔ یا سٹے کا اڈہ کھول لو— تمھیں کوئی ہاتھ نہ لگا سکے گا۔"

اور داداگرجو نے پولیس والوں کی بات مان لی۔ اور ایک دوکان کھول لی۔
اُس کے بعد، جو اُس نے بدمعاشیاں شروع کیں، سارا محلہ اُس سے تنگ آگیا تھا۔ شہر بھر کی رنڈیاں اُس کے گھر آتیں، اور جو اُسے اچھی لگتی، اُسے اپنے پاس رکھتا۔ شہر بھر کے رئیس، اُس کے گھر آتے، تاش کھیلتے، جُوا کھیلتے، شراب پیتے، اور لڑکیوں کے ساتھ سوتے، داداگرجو کا خوب کاروبار چلا تھا۔ وہ دن رات شراب پی کر مست رہتا۔ اس عرصے میں اُس نے تین چار خون کر دیئے لیکن پولیس اُسے پکڑ نہ سکی۔

لیکن کچھ عرصے کے بعد داداگرجو کا کاروبار مدھم پڑ گیا۔ اُس کی پولیس انسپکٹر کے ساتھ لڑائی ہوگئی۔ اور پولیس انسپکٹر نے دوکان کی تلاشی لی، اُس کی بدمعاشیوں کی رپورٹ کی۔ داداگرجو نے پولیس انسپکٹر کی جیب گرم کرنی چاہی، لیکن پولیس انسپکٹر نے بہت رقم مانگی۔ اور داداگرجو اتنی بڑی رقم کا انتظام نہ کر سکا۔

اور آخرکار داداگرجو کو جیل جانا پڑا۔ اُس کے جیل جانے کے بعد، وہ اڈا اُجڑ گیا۔ اُس کی بیویوں نے اور یار تلاش کر لئے، ایک بیوی نے بھی اُس کا ساتھ نہ دیا، اور جب وہ پانچ سال کی جیل کاٹ کر واپس لوٹا۔ تو سُوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا۔ دمے کی شکایت ہوگئی تھی۔ اب دن رات چارپائی پر پڑا رہتا ہے، اور کھانستا رہتا ہے۔

اور میں اپنا قصّہ تو بھول ہی گئی۔ گرجو کی کہانی سُنانے لگی، دراصل شراب پی کر جی چاہتا ہے کہ آدمی باتیں کرتا رہے۔ اور کرتا رہے۔ آپ تو

کماجی کچھ بولتے ہی نہیں، بڑے خاموش رہتے ہیں، ـــ اور ایلن۔ تم کیوں چُپ ہو، کیا کسی یار کی یاد آگئی۔ ارے یار۔ یہ مرد ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں، ان پر کبھی اعتبار نہ کرنا چاہیئے، بڑی ظالم قوم ہے، میں بھی تو ایک ایسے آدمی کے ہاتھ چڑھ گئی تھی، کمارجی، ـــ وہ آدمی، ہماری کھولی کے سامنے والی کھولی میں رہتا تھا۔ ـــ ہمیشہ فرسٹ کلاس سوٹ پہن کر آتا تھا، اکثر وہ میری طرف دیکھتا، اور میں اُس کے سُوٹوں کو دیکھ کر یہ سوچتی۔ کہ یہ آدمی بہت ہی بڑا ہے، شاید کسی دفتر میں نوکر ہوگا۔ وقت پر آتا ہے اور وقت پر جاتا ہے،۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی رہتی تھی، وہ اُسے اپنی بہن کہتا تھا ـــ اُس کی بہن شام کے وقت ایک نہایت ہی اچھی ساڑھی پہن کر نکل جاتی، اور رات کے وقت جب کبھی واپس آتی، تو ہمیشہ ٹیکسی میں آتی، اُن کے گھر میں گراموفون تھا، ریڈیو بھی تھا!۔ لیکن میں اُن کے گھر کبھی نہ گئی، میں ڈرتی تھی، کہ شاید اُس کی بہن مجھے جھڑک نہ دے۔ بھلا اتنے بڑے آدمی کے گھر میں جا کر میں کس طرح بات کروں گی، اور وہ مجھ سے کیوں بات کریں گے،۔ کمارجی، آپ نے عزیز کو نہیں دیکھا، عزیز ہی اُس کا نام تھا۔ اُس کے سوٹ کی کریز کبھی میں نے خراب نہ دیکھی، اُس کا بُوٹ ہمیشہ پالش کیا ہوا ہوتا، اُس کی قمیض کبھی میلی نہ ہوتی۔ اُس کے ہاتھ میں سگرٹ کا ڈبہ ہوتا۔ وہ چپکے سے گھر میں آتا، اور پھر چلا جاتا۔ اور میں دل ہی دل میں عزیز کو چاہنے لگی۔

لیکن اُس سے بات کرتی، تو کس طرح کرتی، اُس سے ملتی، تو کس طرح ملتی۔

ایک دن عزیز نے مجھے خود بلایا، کہنے لگا "فلم دیکھو گی"۔

میں نے سر ہلا دیا۔

اور شام کو وہ مجھے اپنی بہن کے ساتھ سینما لے گیا، عزیز نے مجھے اپنے ساتھ بٹھایا، جب پکچر شروع ہوئی، تو اُس نے میرا ہاتھ دبایا۔

اور میں خاموش رہی۔

اُس نے میرے ہاتھ کو سہلانا شروع کیا۔

میں خاموش رہی۔

اُس نے میری رانوں پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔

میں خاموش رہی۔

اُس نے جوش میں آکر میرے مُنہ کو چوم لیا۔

اور میں خاموش رہی، اور شرم سے میری آنکھیں جھک گئیں،

اور میں نے اُسکے کان میں کہا۔ "اگر تمھاری بہن نے دیکھ لیا تو"۔

اور اُس نے پھر میرا ہاتھ دبایا۔

اور میں چُپ ہو گئی۔

فلم ختم ہو گئی۔ اُس نے مجھے شام کو ملنے کے لئے کہا۔ اور میں مان گئی۔ بمبئی بہت بڑا شہر ہے، یہاں کوئی کسی کی پرواہ نہیں کرتا کمار جی۔ کوئی کسی کے ساتھ رات بھر گھوم کر بھی آجائے، جب بھی سا والوں کو معلوم نہیں ہو سکتا کہ کیا ہوا ہے، اور اُس کے بعد کیا ہو گا۔

اور دوسری شام وہ مجھے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ شراب کی ایک

بوتل منگوائی، اور خود پینے لگا۔ اور مجھے ایک پیگ دیا۔ اور میں نے چپکے سے شراب پی لی، ۔ شروع میں کچھ کڑوی لگی، بعد میں خوب مزا آیا۔ عزیز نے کھانا منگوایا۔ اور ہم دونوں نے خوب جی بھر کر کھایا۔ کھانا اچھا بنا ہوا تھا بہت ہی لذیذ تھا۔ کمرہ صاف اور ستھرا تھا، صرف ایک چارپائی تھی، جس پر سفید چادر پڑی ہوئی تھی، اُس نے سفید چادر کی طرف دیکھا، اور پھر میری طرف دیکھا۔

میں نے زندگی میں پہلی بار شراب پی تھی۔ ایک ہی پیگ سے دماغ چکرا اُٹھا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ کہ دنیا گھوم رہی ہے، چکر لگا رہی ہے، ایک عزیز کے دو دو، چار چار عزیز دکھائی دے رہے تھے۔

'میرا سر چکرا رہا ہے'، میں نے عزیز کی طرف دیکھ کر کہا۔

اور اُس نے کہا کہ 'تم بستر پر لیٹ جاؤ، میں تمھارا سر دباتا ہوں'۔

اور میں سفید چادر پر لیٹ گئی۔

اور وہ میرا سر دباتا رہا۔

اُس کے بعد کیا ہوا۔ مجھے معلوم نہیں۔ جب میں صبح اُٹھی۔ تو سفید چادر پر خون کے نشان تھے۔ خون کو دیکھ کر میں گھبرا گئی۔

'یہ کیا ہوا عزیز'۔

'تم آج سے میری بیوی ہو، عزیز نے مسکرا کر کہا۔

'یہ میرے سہاگ کی رات تھی'۔

اُس رات کے بعد عزیز نے مجھے ایک مکان لے دیا، اور ہم دونوں

اکٹھے رہنے لگے ۔ دو تین دن کے بعد مجھے معلوم ہوا ۔ کہ عزیز کوئی کام نہیں کرتا ۔ اُس کی بہن کسی دوسرے آدمی کے ساتھ بھاگ گئی تھی ۔ ۔۔۔ اور اب میں ہی اُس کا سہارا تھی ۔ اُس نے کہا :-

' سلطانہ ۔ تم کوئی کام کرو '۔

میں نے جواب دیا ' کوئی کام بتاؤ '۔

اور اُس نے یہ کام بتایا ، اور میں نے بغیر کسی حیل وحجت کے کیا ۔ میرے دل میں کبھی گناہ کا خیال نہ آیا ۔ صرف اس بات کا ضرور خیال آیا کہ اگر میں نے یہ کام نہ کیا ، تو بھوکی مر جاؤں گی ۔۔۔ اور عزیز مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا ۔۔۔ اور کما رجی ! ۔ میں نے کھلم کھلا پیشہ شروع کر دیا ۔ ۔ اور عزیز کے لئے بوٹ ، قمیض ، اور اُس کا جیب خرچ ، سب کچھ دیا ۔ وہ ہمیشہ اچھے کپڑے پہن کر گھر سے نکلتا ، ہر روز بوٹ کو پالش کرتا ، اور سلک کی قمیض پہن کر ۔۔۔ کھانا کھا کر ۔۔۔ گھر سے نکل جاتا ، لوگ میرے پاس آتے تو اُس کے ماتھے پر کبھی شکن نہ پڑتی ۔

میں نے سوچا ۔ کوئی بات نہیں ! ۔ اگر اسے گھر سے نکال دوں تو میری رکھوالی کون کرے گا ۔ اور اب عزیز کو چھوڑ کر کہاں جاؤں ۔ اس دنیا میں میرا کون ہے ۔ مجھے کون کما کر کھلائے گا ۔ میری کون خدمت کرے گا ۔ کم از کم عزیز مجھے کپڑے لا کر دیتا ہے ، گو پیسے میں کماتی ہوں ، لیکن عزیز میرا خیال بھی کرتا ہے ، وہ میرے دکھ درد میں شامل ہوتا ہے ۔ وہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھتا ہے ، وہ یہیں کھاتا ہے ، یہیں پیتا ہے ، یہیں رہتا ہے ، اُس

بچارے کا کون ہے، اگر میں نہ کماؤں، تو وہ کہاں سے کھائے گا۔ میری وجہ سے اُس کی عزت بنی ہوئی ہے، میری وجہ سے اُس کے بُوٹ کی پالش قائم ہے، میری وجہ سے وہ سالک کی قمیض پہن سکتا ہے، میری وجہ سے وہ دو وقت کھانا کھا سکتا ہے۔

اور انہی باتوں کو سوچ کر میں نے یہ زندگی اختیار کرلی۔

لیکن یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ عزیز مجھے دھوکا دے کر چلا جائے گا۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا۔ کہ عزیز بھی شروع ہی سے اس قسم کا دھندا کرتا رہا ہے یعنی وہ لڑکیاں رکھتا ہے۔ اور اُن کی کمائی کھاتا ہے۔

جب میں بیمار ہوئی۔ اور ڈاکٹر نے ایک خطرناک بیماری کی طرف اشارہ کیا، تو عزیز کی پیشانی پر بل آگئے۔ اُس کی بھویں تن گئیں۔ اُس دن وہ خاموش رہا۔

دوسرے دن وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

میں انتظار کرتی رہی۔ لیکن وہ نہ آیا۔ میں بیمار تھی۔ اکیلی تھی، پیشہ نہ کر سکتی تھی، کیونکہ بیمار تھی، لیکن اُسے مجھ پر ترس نہ آیا۔ اُس نے مجھے کچھ نہ دیا۔ اور چلا گیا۔ حرام زادہ کہیں کا۔ کمار جی، مرد واقعی حرام زادے ہوتے ہیں۔ تم ہی بتاؤ۔ کمار جی، کیا کوئی عورت اس طرح کر سکتی ہے۔ میں نے جسم بیچا، اور اُس کو کھانا کھلاتا ــــ میں موٹے سیٹھوں کے ساتھ سوئی ــــ تاکہ اُس کے بوٹوں کی چمک قائم رہے۔ اور مجھے عین بیماری کے وقت چھوڑ کر چلا گیا ــــ میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ اُس کے لئے۔ عورت اور کیا

کر سکتی ہے ۔ میں نے اپنی عصمت بیچ دی، اپنا سہاگ لُٹا دیا۔ اپنی عزت کھو دی، اس کی خدمت کرتی رہی ــ لیکن سور کا بچہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا ـــــ تم ہی بتاؤ کمار جی، میں کس طرح مردوں پر اعتبار کروں ۔ اور کیوں کروں ۔ مجھے ہر مرد سے نفرت ہے کمار جی، اور اگر آج کل پیشہ کرتی ہوں، تو صرف پیٹ بھرنے کے لئے ــ ایک دو بار ــ ایک دو جنٹلمین میرے گھر آئے۔ لیکن میں نے اُنھیں صاف صاف کہہ دیا کہ میں کسی مرد کو اپنے گھر میں نہ رکھوں گی ۔ میں ایک کُتا پال لوں گی، ایک بلّی رکھ لوں گی، لیکن کسی مرد کو اپنا مرد سمجھ کر گھر میں نہ رکھوں گی ــ کم ذات ۔ کمینے ــ بھڑوے ــ حرامی ــ اُلّو کے پٹھے ــ بدمعاش ــ لوفر ــ

اور سلطانہ، گالیاں بکتی گئی ــ اور آخر کار رونے لگی ۔

"اور تم بھی رونے لگی" تیسری جلد ہی بول اُٹھی ۔ یہ ایلن تھی۔ ایلن ابھی تک خاموش تھی، وہ برابر شراب پی رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں شراب پی کر سُرخ ہو گئی تھیں لب لعلِ احمریں کی طرح سُرخ ہو گئے تھے ۔ رخساروں پر ایک عجیب سی دل آویزی آ گئی تھی ۔ اُس نے فراک پہنا ہوا تھا، اور نیچے سکرٹ ۔ اُس کی گوری گوری پنڈلیاں ۔ اُس کے ننگے سفید بازو اُس کی شوخ نگاہ، ــ ان سب میں ایک عجیب سی چمک تھی ۔ ان سب میں ایک عجیب قسم کا بلاوا تھا ۔

'مرد حرام زادے ہوتے ہیں، ایلن نے شراب کا آخری گھونٹ پیا ــ اور کہنے لگی: مسٹر کمار ــ یہ بوتل کھالی ہے ۔ اس میں شراب کا ایک

ایک بوند نہیں۔ ہم ایسا عشق نہیں کرتا جیسے اس نے کیا۔ جیسے سلطان نے کیا ہم بھی اکسٹرا میں کام کرتا تھا! ہم خوبصورت تھا، کمار بابو، ہم بہت اچھا تھا۔ تم نے ہم کو اس سے پہلے نہیں دیکھا۔ دیکھتا، تو خوش ہو جاتا۔ ہم جہاں جاتا۔ آدمی ہمارے ساتھ آتا۔ ہم نے اکسٹرا میں خوب پیسا کمایا، ہم رنجیت میں نوکر تھا۔ ہم ہر فلم میں کام کرتا تھا۔ اور ہم کو خوب پیسا ملتا تھا جس فلم میں کام کرتا۔ ہم کو کلوز اپ ملتا۔ ہم ہیرو سے ہنستا، ڈائریکٹر خوش ہو کر بات کرتا! اور ہم بھی خوش ہو کر اُن سے بات کرتا! وہ یہ سمجھتا کہ ہم اُن پر مرتا ہے، اور ہم یہ سمجھتا کہ وہ ہم پر مرتا ہے۔ ایک بار۔۔۔ ایک ڈائریکٹر نے ہم کو گھر پر بلایا۔ میں اُس کے پاس نہ گئی۔ اُس نے غصّے میں آکر رنجیت سے باہر نکال دیا۔ ہم نکل گیا ہم نے دوسری کمپنی میں نوکری کر لیا۔ ہم کیوں ڈرتا کسی سے، لیکن وہاں بھی یہ بات ہوا وہاں کے ڈائریکٹر نے کہا، "دیکھ ایلن ہم تمھیں ہیروئن بنا دے گا۔ ہم تم کو زبان سکھا دے گا، تم ہمارا کہنا مانا۔۔۔ اور جو کچھ ہم تم کو کہنا۔۔۔ تم کرنا۔"

ہم بولا، "تم کیا چاہتا ہے؟"

وہ بولا، "تم ہمارے ساتھ شراب پیو۔"

ہم نے کہا، "لاؤ"

اور ہم دونوں نے شراب پیا۔ اُس نے مجھے چھیڑا۔ اور میں نے اُس کے زور سے تھپڑ مارا۔ بچارا گجراتی تھا۔ منھ سے لہو نکل آیا۔ اُس نے مجھے سو روپے کا نوٹ دیا، اور کہنے لگا۔ "کسی سے نہ کہنا۔ کہ تم نے ہم کو پیٹا۔" اُس نے ہم کو کار دیا، اور ہم گھر چلا آیا۔ دوسرے دن اس نے ہم کو کمپنی

سے نکال دیا۔

ہم تیسری کمپنی میں نوکر ہوگیا۔ ہمارا Face اچھا تھا، اس لئے لوگ ہم کو نوکر رکھتا تھا۔ لیکن ہر کمپنی کا ڈائریکٹر اور ایکٹر لوگ ہم پر مرتا تھا۔ لیکن ہم کسی پر نہ مرتا تھا۔

ایک دن ہم ایڈورڈ پر مرنے لگا۔

وہ ہم پر مرنے لگا۔

ہم اپنے ماں سے جھگڑا۔ اور ایڈورڈ کے ساتھ رہنے لگا۔ اُس کا ماں ہم سے نفرت کرتا تھا۔ اُس نے کہا۔ 'تم فلم میں کام کرتا ہے، تم بدمعاش ہے'۔

ہم نے کہا، 'ہم بدمعاش نہیں ہے'۔

اُس نے کہا۔ 'تم لوفر ہے، ہمارے بیٹے کو پھنسایا ہے'۔

ہم نے کہا، 'ہم لوفر نہیں ہے، ہمیں تمہارے بیٹے سے Love ہوگیا ہے'

اور اس طرح ہر روز اُس کی ماں سے جھگڑا ہوتا۔ اُس کی ماں ہم کو گالی دیتا — اور ہم اُس کو گالی دیتا، ہم کلہے کو چُپ رہ۔ لیکن ایڈورڈ نے مجھ کو دھوکا دیا۔ سالا دوسری لڑکی سے عشق کرنے لگا۔ اور مجھ کو چھوڑا — وہ لڑکی اچھے گھر کا تھا۔ اُس کی ماں نے یہ رشتہ ڈھونڈا تھا۔

ایڈورڈ نے مجھے گھر سے نکال دیا۔

اور اُس رات ہم خوب رویا۔ اور اُسکے بعد ہم پھر فلم میں کام کرنے لگا۔ ہم جیون فلم کمپنی میں گیا، اُس کا ڈائریکٹر ہم کو دیکھ کر مسکرایا۔ اور بولا

'ایلن، کام کرو گی'؟

ہم بولا 'ہم کام کریں گے'۔

ایک رات جیون فلم کمپنی کے مالک نے ہم کو گھر پر بلایا۔ ہم چلا گیا۔ دُبلا پتلا سیٹھ تھا۔ میز پر شراب رکھی ہوئی تھی، مُنھ سے بدبو آ رہی تھی، اُس نے شراب کا پیگ دیا، ہم نے پی لیا۔

اُس نے کہا۔ 'ہم کو ہیروئن بنائے گا'!

اس دفعہ ہم نے اُس کو تھپڑ نہیں مارا۔

ہم نے اور شراب پی! ——ہم اُس رات ایڈورڈ کو بھول گیا۔ اور سیٹھ کے ساتھ سو گیا۔

اور اُس کے بعد ہم چندو سیٹھ کے پاس سویا، بُندو سیٹھ آیا—، گُندو سیٹھ آیا، رام چندر آیا، شام چندر آیا، کلدیپ آیا، اور اس طرح بہت سیٹھ آئے، بہت ڈائریکٹر آئے، بہت ہیرو آئے، اور ہم سب کے ساتھ شراب پی کر سو گیا۔

ڈائریکٹروں نے ہمارا کلوز اپ لیا، سیٹھوں نے ہمیں ہیروئن بنایا! لیکن سب جھوٹ، ہم زبان نہ بول سکتا تھا۔ اس لئے مکمل ہیروئن نہ بن سکا، اکسٹرا کا اکسٹرا رہا۔

ہم کو ان سیٹھوں سے کسی سے نفرت نہیں ہے، صرف ایڈورڈ سے نفرت ہے، اُس کی ماں سے نفرت ہے، اگر ایڈورڈ ہمارا ساتھ دیتا، تو آج یہ ہمارا دن نہ ہوتا۔

اور کمار جی نے ایلین کی طرف دیکھا، ایلین کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی کی جھلک تھی، وہ کھُل کر رونا چاہتی تھی۔ لیکن زندگی نے اُسے اتنا سنگدل بنا دیا تھا۔ کہ وہ اس وقت کھُل کر رو نہ سکی!۔ کمار جی نے کمرے میں نظر دوڑائی، رسیا بستر پر دراز ہو گئی تھی، اُس کے بلاؤز کے بٹن کھُل گئے تھے، اور اُس کا سینہ برہنہ ہو چکا تھا!۔ رسیا کو اس وقت شراب کافی چڑھ چکی تھی، کمار جی نے اُٹھ کر رسیا پر چادر ڈال دی۔

اور سلطانہ صوفے پر ہی سو گئی تھی!۔ اُس کی آنکھوں سے ڈھلکتے ہوئے آنسو اُس کے گالوں پر بکھر گئے تھے،۔ سینے سے دوپٹہ سرک گیا تھا!۔ اور پیشانی پر زلفیں بکھر گئی تھیں۔

صرف ایلین جاگ رہی تھی، میز پر خالی گلاس پڑے ہوئے تھے۔، وسکی کی خالی بوتل پر ایلین کی نگاہ تھی، سوڈے کی خالی بوتلیں فرش پر پڑی ہوئی تھیں، طشتری میں کچھ چُورا پڑا ہوا تھا۔ اور ایلین جاگ رہی تھی، کمار جی جاگ رہے تھے، ایلین کی نگاہوں میں آگ تھی!۔ شراب کی گرمی نے اُسے انگارہ بنا دیا تھا، زندگی کی ہر لغزش نے اُسے اخلاق کے ہر پہلو سے بے نیاز کر دیا تھا،۔ اور کمار سوچ رہا تھا، کہ مرد واقعی حرام زادے ہوتے ہیں ہاں تین لڑکیوں میں ہر ایک نے اپنا اپنا مرد چُنا۔ لیکن مرد نے آخر میں جا کر وہ ٹھوکر لگائی، کہ انھیں یہ راستہ اختیار کرنا پڑا۔ بے وفائی اور پیٹ کی بھوک، پیٹ کی بھوک اور بے وفائی، اُن کی زندگیوں میں ہزاروں مرد آئے،۔ چنو بھائی، منو بھائی۔ بندو خاں، چھندو، چندو خاں، امرت لعل، رلئے چند،

شام لعل۔ امیر علی، غریب علی، شریر علی، صغیر علی، کبیر علی۔ پردیپ، کلدیپ، شردیپ، رکھ دیپ، رمیش چند، کھیم چندر، رحیم چندر۔ گندر۔ بھنڈر۔ پرجندا۔ جنہندا۔ گجندا۔ جہیندا۔ کھمبندا۔ مکنیدا۔ اور وہ اسی طرح گردان کرتا گیا۔ کہ اسکا ذہن ان ناموں سے پراگندہ ہوگیا۔

اور ایلین جاگ رہی تھی۔

'مرد واقعی حرامزادے ہوتے ہیں'۔

ایلین نے سکرٹ پہنی ہوئی تھی، اُس کی پنڈلیاں، برہنہ تھیں، وہ بار بار پنڈلیوں کو کھجلاتی تھی۔ وہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیرتی تھی۔ وہ بار بار خالی گلاس کو منہ لگاتی، اور چٹخارہ لیکر اُسے پھر میز پر رکھ دیتی!۔ ایلین واقعی خوبصورت تھی۔ شراب نے اُسے زیادہ حسین بنا دیا تھا!۔ اُسکے تنفس کو اور تیز کر دیا تھا!۔ اُسکے خون کی روانی اور تیز ہوگئی تھی۔

اور وسکی کی خالی بوتل میز پر تھی۔

وہ آگے بڑھا۔ اُس نے آگے بڑھنا چاہا۔ اُسکا ہاتھ آگے بڑھا۔ معاً اُسکا ہاتھ وسکی کی خالی بوتل سے ٹکرایا، اور بوتل نیچے گر کر چکنا چور ہوگئی۔

'مرد واقعی حرامزادے ہوتے ہیں' اُس نے سوچا۔

ایلین واقعی خوبصورت تھی!۔ اُس کی آنکھیں خوبصورت تھیں! اُسکے ہونٹ خوبصورت تھے!۔ اُس کی ناک خوبصورت تھی، اُس کے کان خوبصورت تھے۔ اُسکے بال خوبصورت تھے وہ بہت خوبصورت تھا۔ جس وقت اُس نے ایلین کو دیکھا، اُسکے سینے میں ایک طوفان اُٹھ آیا۔

اسوقت یہاں کچھ نہ تھا، وسکی ختم ہوچکی تھی! سوڈا ختم ہوچکا تھا، رسیا سوگئی تھی!۔ سلطانہ سوگئی تھی۔ صرف ایلین جاگ رہی تھی، اُسکا جسم جاگ رہا تھا، وہ لمحہ جاگ رہا تھا، وہ رات جاگ رہی تھی۔ بجلی کا قمقمہ جاگ رہا تھا! ـــ وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ لیکن کسی نے پیچھے سے اُسکا گلہ دبوچ لیا!۔ اُسکے قدم وہیں رُک گئے، اُسکے بازو وہیں کے وہیں رہ گئے وہ نگاہ وہیں جم گئی!۔

اُسے ایلین نظر آئی، وہی پرانی ایلین، چودہ سال کی ایلین، جس نے سیٹھ کے مُنھ پر تھپّڑ مارا تھا۔

وہ اس وقت ایڈورڈ نہ بننا چاہتا تھا!

وہ اس وقت بنواری نہ بننا چاہتا تھا!!

وہ اس وقت عزیز نہ بننا چاہتا تھا!!!

رات جاگ رہی تھی۔ ایلین جاگ رہی تھی، وہ اُسی وقت کمرے سے نکلا، اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا، اندھیرے میں گُم ہوگیا۔

انسان کی لاش

صفحات :- ۱۰

شرنارتھیوں کے لئے کیمپ کھُل گیا تھا۔ ایک چھوٹے سی ٹینٹ میں اسکول کھولا گیا تھا۔ اس اسکول میں صرف ہندوؤں کی لڑکیوں کو پڑھایا جاتا تھا۔ لڑکیوں کی عمریں زیادہ نہ تھیں !۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جو پاکستان سے بچکر آئی تھیں !۔ ان میں کسی کی ماں مرگئی تھی !۔ کسی کا باپ قتل کر دیا گیا تھا۔ کئی لڑکیوں کی مائیں ابھی تک پاکستان میں تھیں، کتنوں کا سارا خاندان تباہ و برباد ہو گیا تھا، اور کئی لڑکیوں کو یہ بھی علم نہ تھا۔ کہ اُنکے والدین زندہ ہیں، یا قتل کرائے گئے ہیں !۔ لڑکیاں ہندوؤں کی تھیں لیکن سکول کی اُستانی مسلمان تھی !۔ جب دہلی میں ہندو مسلم فساد شروع ہوا۔ اور ہندو اور سکھوں نے مسلمانوں پر وہ ظلم ڈھائے، جنکی نظیر، ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی،۔ لوگ کہتے ہیں، کہ ہندو اور سکھوں نے مسلمانوں سے

بدلا لیا تھا لیکن کن مسلمانوں سے ،کن مسلمان عورتوں سے ،لیکن کن مسلمان بچوں سے
شاید ان لوگوں نے یہ نہ سوچا !۔ کہ وہ جن مسلمانوں کو تہ تیغ کر رہے ہیں ،انکا
مغربی پنجاب پر ظلم ڈھانے میں کوئی ہاتھ نہ تھا ۔ بربریت کے اس عہد میں
کسی نے کچھ نہ سوچا ،۔ کہ یہ عورت جسکو وہ ننگا کرکے بازار میں لے جارہے
ہیں ،یہی انکی دادی اماں تھی ،اسی سے وہ دہلی کی گلیوں میں وہ کئی بار مل چکے
تھے ،اسی دادی اماں نے انکے سروں پر شفقت کا ہاتھ پھیرا تھا ۔ درازئ عمر
کی دعا کی تھی !۔ اُن کی پیشانی چومی تھی ،انکے بیاہ میں ڈھولک بجائی تھی ،
گیت گائے تھے لیکن انہی سنگدل ہاتھوں سے دادی اماں کا گلا گھونٹ
دیا !۔ اسکی بچیوں کو نیزہ پر چڑھا کر اپنی اندھی حیوانیت کا ثبوت دیا !۔ لوگ
کہتے ہیں ،کہ جب ہندو فسادیوں کے ہاتھ میں ایک دایہ لگی ،تو انھوں نے
اس سے پوچھا ۔

'تمھارا نام'۔

'دایہ'۔

'ہندو ہو یا مسلمان'

'دایہ'

بولتی نہیں '

'میں ہندوؤں کے گھروں میں گئی ہوں اور مسلمانوں کے گھروں
میں بھی !۔ میں نے ہندوؤں کے بچوں کو اسی گود میں پالا ہے ،انکو ان
تھنوں سے دودھ پلایا ہے ،ان ہاتھوں سے نھیں نہلایا ہے ،کھلایا ہے ،

اور اسی طرح مسلمانوں کے بچّوں کو پالا ہے، پوسا ہے!۔ میں سب کی ماں ہوں!:۔

ایک سکھ نے آگے بڑھ کر اُسکا بازو اس زور سے مروڑا۔ کہ دایہ کے مُنھ سے اللہ کا کلمہ نکل گیا۔ واہگوروکا نام لے کر سکھ کی کرپان اس دایہ کے پیٹ میں تھی!۔ اور دایہ لڑکھڑاتی ہوئی زمین پر گر پڑی اور دوبارہ زمین سے نہ اُٹھ سکی! آج ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی مائیں مر چکی تھیں!۔ دونوں کے بچے خون کی ہولی کھیل رہے تھے!۔ اپنی ماں اور بہنوں کی عزت اور عفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، دونوں ایک دوسرے کو تباہ کر رہے تھے۔

——— اسکول کی مسلمان اُستانی یہ سوچ رہی تھی!۔ کہ گھنٹی بجی، اور لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں!۔ آج اسکول میں لڑکیوں کی تعداد کافی تھی!۔ سامنے بورڈ پر ہندوستان کا نقشہ لٹک رہا تھا۔ اُستانی نے رجسٹر سے لڑکیوں کا نام پکارا۔ سب کی حاضری لی، اور پھر نقشے کی طرف دیکھنے لگی۔ اور کہنے لگی:۔

"یہ ہے ہندوستان!۔ یہ ہے ہمارا دیس!۔ یہ ہیں اسکے پہاڑ! یہ ہے مونٹ ایورسٹ — دنیا کی سب سے بڑی چوٹی!۔ یہ ہے، کشمیر — ہندوستان کی جنت!۔ اور یہ جنگل، دریا!۔ سمندر ——— یہ ہی پنجاب۔ راوی کے اُس پار مسلمان بستے ہیں، اور ادھر ہندو — میں تمھیں ہر روز یہ سبق پڑھاتی ہوں، اس نقشے کی طرف دیکھو، اس کی حدیں بھول نہ جانا (لڑکیوں کی طرف دیکھ کر) بھلا کہاں دیکھ رہی ہو۔ اُستانی نے کرخت

لہجہ میں یہ الفاظ کہے۔

بملا نے اُستانی کی طرف دیکھا۔ اور کچھ گھبرا سی گئی!۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی!۔ اُس کا دھیان نقشے کی طرف نہ تھا۔ بملا کی عمر ہو گی، آٹھ نو برس!۔ اُس کی نیلی نیلی آنکھیں، حیران اور ششدر ہو کر رہ گئی تھیں کبھی وہ اُستانی کی طرف دیکھتی۔ کبھی بورڈ کی طرف اور کبھی بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی طرف!۔ جو اُس کی طرف بار بار دیکھ رہی تھیں!۔ جب کبھی اُستانی بملا سے کوئی سوال پوچھتی۔ بملا ہمیشہ اُوٹ پٹانگ جواب دیتی!۔ اُستانی جواب سُن کر ہمیشہ اُسے جھڑکتی!۔ آج جب بملا نے پھر اُس کے سوالوں کا ٹھیک جواب نہ دیا، تو اُستانی آپے سے باہر ہو گئی۔ اور چیخ کر بولی۔

'ہندوستان کی تقسیم کس نے کی ہے'۔ جواب ندارد۔

'ہندوستان میں کس قوم کے باشندے بستے ہیں؟'۔ بملا خاموش تھی۔

'پاکستان میں کونسی قوم بستی ہے؟'۔ بملا خاموش تھی۔

'جالندھر کہاں ہے بملا؟' اُستانی نے کڑک کر پوچھا۔

'وہاں ہے'۔ بملا نے نقشے کی طرف دیکھ کر کہا۔

'وہاں کہاں۔ ہندوستان میں یا پاکستان میں'۔

'پاکستان میں'۔ بملا نے حیران کُن نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

یہ جواب سُن کر سب لڑکیاں ہنس پڑیں۔

اُستانی جی کو اور غصّہ آیا۔ اُس نے بملا کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھا!۔ اور کہا۔ "تم کیا کرتی ہو۔ تمھارا دھیان کس طرف ہے!۔ کھڑی ہو جاؤ بنچ پر۔ دیکھو اُنگلی کو مُنھ میں نہ ڈال۔ سیدھی کھڑی رہ۔ تمھیں یہ بھی معلوم نہیں۔ کہ جالندھر کہاں ہے؟۔ اتنی سی بات۔ کیا کرتی ہو دن رات پڑھتی کیوں نہیں ہو!۔ ناخنوں کو دانتوں سے کاٹتی رہتی ہو۔ اگر تم اس طرح پڑھتی رہیں، تو کبھی امتحان پاس نہ کر سکوگی"۔

بملا چُپ چاپ کھڑی رہی، اور پریشان کُن نگاہوں سے اُستانی کی طرف دیکھتی رہی۔

"تو یہ ہے ہندوستان کا نقشہ۔ ادھر پاکستان ہے، یہاں مسلمان رہتے ہیں، مسلمان جناحی ٹوپی پہنتے ہیں، وہ ہندو اور سکھوں سے نفرت کرتے ہیں!۔ پہلے یہ دونوں بھائی بھائی تھے، بڑے آرام اور پیار سے رہتے تھے!۔ اگر گھر میں لڑائی جھگڑا ہوتا تھا تو خود ہی نبٹ لیتے تھے۔ اب کے جھگڑا ہوا۔ تو اُنھوں نے انگریز کو بُلایا۔ اور انگریز نے دونوں کو اپنا اپنا حصّہ دے دیا ــــ ادھر ہندوستان ہے، یہاں زیادہ تر ہندو رہتے ہیں، ہندو دھوتی پہنتا ہے، ماتھے پر تلک لگاتا ہے، اور اکثر تر تھ یاترا کرتا ہے!۔ ہندو مسلمان سے نفرت کرتا ہے! تو یہ ہے، ہمارا ملک۔ اور ہم ہیں اسکے باشندے، اگر پاکستان جانا ہو، تو پاسپورٹ لے کر جاؤ۔ اور ہندوستان آنا ہو تو بھی پاسپورٹ لے کر آؤ۔ ہمارا ملک بہت بڑا ملک ہے، یہاں کارخانے ہیں، ملیں ہیں،

ہوائی جہاز ہیں، فیکٹریاں ہیں، چمکتی ہوئی سڑکیں ہیں، پیداوار کافی ہے لیکن لوگ بھوکے مرتے ہیں! کپڑا بہت بنتا ہے، لیکن لوگوں کو ننگا رہنے کا شوق ہے!۔ اس ملک میں سونے کی کانیں ہیں، چاندی کی کانیں ہیں!۔ کوئلے کی کانیں ہیں!۔ ہندوستان میں تاج محل ہے، قطب صاحب کی مینار ہے، لعل قلعہ ہے۔ اور اب اُس کی آبادی چالیس کروڑ سے پینتیس کروڑ رہ گئی ہے!۔ سمجھ گئیں بملا۔ کیا کہا میں نے۔"

'شانتی۔ دنیا میں سچے آدمی کی عزت ہوتی ہے، یا جھوٹے کی؛

'سچے آدمی کی اُستانی جی'۔ شانتی نے فوراً جواب دیا۔

'شاباش؛ اُستانی جی نے خوش ہو کر کہا۔

'لڑکیوں یہ بتاؤ۔ کہ ہندو بڑا ہے یا مسلمان؟"

'ہندو' سب لڑکیوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

'شاباش'، اُستانی نے چیخ کر کہا۔

'تم بتاؤ۔ بملا۔ تم کیوں خاموش ہو، ہندو بڑا ہے یا مسلمان'۔

بملا خاموش تھی۔

'بولتی کیوں نہیں، جواب کیوں نہیں دیتی، نقشے کی طرف گھور گھور کر کیوں دیکھ رہی ہو، انگلیوں سے نہ کھیلو، گردن اونچی کرو۔ پیچھے نہ دیکھ سیدھی کھڑی رہ'۔

آج اُستانی جی کو ضرورت سے زیادہ غصہ آرہا تھا۔ وہ غصے میں بھری ہوئی بملا کے قریب چلی گئی۔

'بتاؤ۔ ہندو بڑا ہے یا مسلمان'۔ اُستانی نے چیخ کر کہا۔
بملا خاموش تھی۔
'نکل جا یہاں سے، اسی وقت چلا جا۔ نہیں تو مار مار کر جان نکال دونگی'
اور بملا جانے لگی۔
'ٹھیر جا'۔
باقی سب لڑکیوں کو اُستانی نے چھٹی دیدی۔ لڑکیاں چلی گئیں۔
کمرے میں بملا اور اُستانی جی رہ گئیں۔ بملا رو رہی تھی۔
اُسے روتا دیکھ کر اُستانی جی کو رحم آگیا۔
'کیوں رو رہی ہو میری بچی'
'اُستانی جی'۔ بملا نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ 'میں ـــــ
میں رات بھر نہ سو سکی'
'کیوں میری بچی'۔ آواز میں شفقت اور پیار تھا۔
'رات بھر اماں جاگتی رہی، اور روتی رہی'۔
'وہ کیوں'۔
ماتاجی نے مجھے بتایا۔ کہ میرے پتاجی کو کل گاؤں میں قتل کر دیا گیا۔ وہ چھپ کر ایک مسلمان کے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے، کہ لوگوں کو علم ہو گیا۔ انھوں نے اس مسلمان کو مار ڈالا اور میرے پتاجی کو بھی'۔
یہ کہکر بملا رونے لگی۔ 'میں رات بھر جاگتی رہی، مجھے بالکل نیند نہ آئی'۔
میرے پتاجی معلوم نہیں، اب کہاں ہونگے۔ ماتاجی کہتی ہیں کہ وہ واپس

نہیں آئیں گے؟

یہ سُنکر اُستانی جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے. غصّہ کافور ہو گیا. اس نے اپنے ساڑھی کے پلو سے بملا کے آنسو پونچھے. اور کہنے لگی. 'رو مت میری بچی! میں بھی رات بھر نہ سو سکی میں بہت پریشان تھی. ایک پل بھر نہ سو سکی.

'وہ کیوں' بملا نے روتے ہوئے کہا.

'میرا بھائی جالندھر میں تھا. ہندوؤں کے قبضے میں آ گیا. اور بچارا مارا گیا. ایک ہی بھائی تھا میرا. خاندان کی آخری نشانی تھی وہ بھی بچارا قتل کر دیا گیا.'

'کِس نے مارا اُستانی جی؟'

'ہندو نے.'

دونوں نے ایکدوسرے کی طرف دیکھا. سامنے نقشہ لٹک رہا تھا. ہندوستان کا نقشہ. ایکطرف ہندو. دوسری طرف مسلمان. ایک دل کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے. ایک ہی وطن، جسکی تقسیم میں خون کی ندیاں نہ نکلیں، نہ ہندو بڑا تھا. نہ مسلمان. دونوں رہزن تھے. دونوں حیوان تھے

دونوں نے گھور کر نقشے کی طرف دیکھا.

ایک طرف ہندو کھڑا تھا. دوسری طرف مسلمان کھڑا تھا. اُن دونوں کے درمیان انسان کی لاش تھی. دونوں کمرے سے باہر نکل گئیں

تلخی

صفحات :- ۱۶

جب میرے ذہن میں تلخی اور گھٹن زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ تو میں (EROS) سینما کی طرف رُخ کرتا ہوں!۔ جب سیمنٹ کی اُس عالی شان عمارت کی طرف نگاہ ڈالتا ہوں۔ تو دل میں ایک قوت اور توانائی کا احساس ہوتا ہے میرے قدم یکایک آگے بڑھتے ہیں۔ میں سب سے پہلے وزن کرنے والی مشین کی طرف جاتا ہوں، ایک آنہ ڈال کر وزن کا کارڈ نکالتا ہوں، اور اُس پر لکھی ہوئی قسمت کو بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ وزن اُتنا ہی ہے، نہ بڑھا ہے، نہ گھٹا ہے۔ لیکن کارڈ پر لکھے ہوئے الفاظ بدل گئے ہیں۔

وہ پہلے اور تھے اب اور ہیں۔ لکھا ہوا تھا۔ "کچھ عرصہ اور انتظار کرو۔ اچھے دن آئیں گے۔" اور میں کارڈ کو جیب میں ڈال کر تصویروں والے

بورڈ کی طرف جھکتا ہوں۔ ہالی ووڈ کی تصویریں کتنی دلکش اور جاذب نظر ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ خیال ہوتا ہے، کہ اس قسم کے مرد اور عورتیں، اس خطہ زمین پر ہیں بھی یا نہیں لیکن بار بار جب نگاہیں ان تصویروں سے چار ہوتی ہیں۔ تو یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ ایکٹرس کتنی صحت مند اور خوبصورت ہیں، ہماری ایکٹرسوں کی طرح نہیں۔ جو آن واحد میں پھول کر کپّا ہو جاتی ہیں، یا دُبلی ہونے پر آتی ہیں، تو سوکھ کر کانٹا ہو جاتی ہیں، امریکہ والوں نے عورت کے حُسن سے صحت مندانہ حظ اُٹھانے کے مختلف طریقے اختیار کئے ہیں۔ وہ عورت کے حُسن کو چُھپاتے نہیں۔ اُنکی خوبصورتی پر پردہ نہیں ڈالتے۔ بلکہ عورت کے جسم کے حسین خطوط کو بے نقاب کرتے ہیں،

ڈورتھی عیار کی خوبصورت ٹانگوں اور رانوں سے ساری دنیا حظ اُٹھاتی ہے۔ کسی ایکٹرس کے بالوں کو ریشمی بنا کر۔ اُس کے گداز شانوں پر بکھرا کر وہ اتنا دلفریب نقشہ بناتے ہیں۔ کہ اُسکے ریشمی بالوں کو دیکھکر ذہن میں ایک غنودگی سی آجاتی ہے۔ ہالی ووڈ کے ماہرین یہ اچھی طرح جانتے ہیں، کہ ہر مرد، عورت کے خوبصورت جسم کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے، اس لئے وہ عورت کی چھاتیوں، اُسکے کولھوں، اُسکے بالوں، اُسکی مسکراہٹ۔ اُسکی آنکھوں، اُسکی لانبی لانبی اُنگلیوں، اُسکے بھرے ہوئے ہونٹوں، اُس کی صراحی دار گردن، اُسکے لانبے قد کو مختلف زاویوں سے اُجاگر کرتے ہیں۔

میں اکثر ان خاموش تصویروں کو دیکھتا رہتا ہوں۔ اور پھر

شفاف چمکتے ہوئے فرش پر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوں۔ فرش ختم ہوتا ہے، تو سیڑھیوں کی طرف رُخ کرتا ہوں۔ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہوں اور دیواروں پر لگی ہوئی تصویروں کو دیکھتا جاتا ہوں! صفائی اور خوبصورتی زندگی میں زندہ رہنے کی خواہش پیدا کرتی ہیں۔

وائیں دیوار پر ایک خوبصورت عورت کا چہرہ مُسکرا رہا ہے۔ یہ چہرہ کہہ رہا ہے، "میں خوبصورت ہوں میرے ریشمی بال دیکھو۔ میرے مرمریں چہرہ کو دیکھو، میری آنکھوں میں تازگی ہے، نگاہوں میں چمک ہے میں خوب کھاتی ہوں، پیتی ہوں۔ میں بہار سے محبت کرتی ہوں، سمندر سے پیار کرتی ہوں۔ صحت مند مرد کو چاہتی ہوں۔" ان آنکھوں میں فریب کم ہے جھوٹے اخلاق کا خول نہیں، زندگی میں خوش رہنے کی تمنا ہے۔

اب سیڑھیاں ختم ہوگئیں ہیں، اور میں اوپر والے ہال میں پہنچ جاتا ہوں۔ اس ہال میں بہت سی کرسیاں ہیں۔ چمکتی ہوئی میزیں ہیں۔ دیواروں پر نامور ایکٹر اور ایکٹرسوں کی تصویریں ہیں، ایکٹرسوں کی زیادہ۔ اور ایکٹروں کی کم۔ آج گرمی بہت زیادہ ہے، میں پنکھے کے نیچے ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں، اور پھر چُپکے سے، خاموشی سے ایک بیرہ آتا ہے، صاف اور سُتھرے کپڑوں میں ملبوس، میں اُسے آئس کریم کا آرڈر دیتا ہوں۔

آئس کریم واقعی لذیذ چیز ہے، اور خاص کر اس گرمی کے موسم میں، عورت کی طرح نرم اور فرحت بخش۔ مُنھ میں ڈالو، کہ فوراً حلق سے نیچے اُترتی ہوئی، پیٹ تک۔ ایک یخ بستہ، احساس جسم میں عود کر آتا ہے

دیکھنے میں کریم بھی خوبصورت ہے۔ ایک چھوٹا سا گلاس کا کپ ہے، اُس میں آئس کریم رکھی ہوئی ہے۔ اوپر کا تھوڑا حصہ سُرخ اور نیچے سے سفید اور مُلائم، بالکل عورت کے گالوں کی طرح، صحت مند عورت کے گالوں کی طرح کہیں کہیں سُرخی زیادہ۔ اور کہیں کہیں کم۔۔۔ اور میں آہستہ آہستہ کریم کو چمچے کے ذریعے، مُنہ میں ڈالتا ہوں، اور اُسکے ٹھنڈے لمس سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ ہال میں آدمی آتے ہیں، عورتیں آتی ہیں۔ ابھی ایک جوڑا داخل ہوا ہے دونوں انگریز ہیں۔ دونوں نے مغربی انداز کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ عورت نے فراک پہنا ہوا ہے، اُسکی پنڈلیاں، اُسکا متناسب جسم، اُسکے کھلے بازو، اُسکے بالوں کا کندھوں پر بکھر جانا، عجیب تاثر پیدا کرتا ہے۔ مرد نے عورت کی کمر میں ہاتھ ڈالا ہوا ہے، اور عورت مُسکرا مسکرا کر اُسکی طرف دیکھ رہی ہے۔ ہال میں بیٹھے ہوئے ہندوستانیوں کی نگاہیں اُس جوڑے کی طرف منقلب ہوتی ہیں، مرد کرسی کو آہستہ سے پیچھے کرتا ہے، عورت اُس کرسی پر بیٹھ جاتی ہے، مرد پھر کرسی کو آگے کر دیتا ہے، اور خود ساتھ والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے، باہوں کو میز پر رکھ اپنی محبوبہ کی طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ بیرہ آتا ہے، اور مرد آئس کریم کا آرڈر دیتا ہے!۔۔۔

اور میں آہستہ آہستہ کریم کھا رہا ہوں۔ جیب میں صرف ایک آئس کریم کھانے کے پیسے ہیں!۔ اگر میں نے جلدی سے اس آئس کریم کو کھا لیا، تو مجھے دوسری پلیٹ کا آرڈر دینا پڑیگا۔ اور میں تو صرف وقت صرف کرنے آتا ہوں۔ کیونکہ جہاں میں رہتا ہوں، وہ کافی گندی جگہ ہے، گو ظاہری طور پر

بلڈنگ اتنی گندی نہیں لیکن جونہی آپ بلڈنگ کے اندر قدم رکھتے ہیں کہ، گندگی آپکا سواگت کرتی ہے۔ بدبو سے ذہن بوجھل ہو جاتا ہے۔ اور میں جلدی سے سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہوں۔ یہ سیڑھیاں سنگِ مرمر کی ہیں۔ نہایت گندی سیڑھیاں ہیں۔ ان پر اکثر پانی چھڑکا رہتا ہے "تاکہ لوگوں کو پھسلنے میں آسانی ہو" اور وہ بازو یا ٹانگ کو زخمی کر کے کسی ہسپتال میں جا سکیں،۔ ایکبار میں بھی انہی سیڑھیوں سے گر چکا ہوں۔ اوپر کی سیڑھی سے گرا تھا۔ اور نچلی سیڑھی تک لڑھکتا ہوا پہنچ گیا تھا۔ میرے بائیں بازو پر کاری ضرب لگی تھی، مسلسل دو مہینے ہسپتال میں رہا تھا۔ اور علاج کرتا رہا۔ بازو تو ٹھیک ہو گیا لیکن ابھی تک درد باقی ہے!۔ اور جب کبھی سیڑھیاں اُترتا ہوں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ آتش فشاں پہاڑ کی چوٹی سے نیچے اُتر رہا ہوں۔ نہایت سوچ سمجھ کر قدم رکھتا ہوں لیکن پھر بھی گرنے کا احساس ذہن میں رہتا ہے۔

ابھی ابھی دو لڑکیاں داخل ہوئی ہیں، اُنکے ساتھ صرف ایک مرد ہے، دونوں نے ساڑھیاں پہنی ہوئی ہیں!۔ ان لڑکیوں کو واقعی ساڑھیاں پہننے کا انداز آتا ہے، کئی لڑکیاں تو صرف ساڑھی لپیٹنا جانتی ہیں، جیسے مُردے کے اردگرد سفید چادر لپیٹ دی جائے، لیکن ان لڑکیوں نے واقعی ساڑھی کو تو اس انداز سے پہنا ہے۔ کہ جسم کی ساری رعنائیاں اُجاگر ہو گئی ہیں — اور بلاؤز کا کٹ کتنا خوبصورت ہے، گردن کا پچھلا حصہ کسقدر خوشنما لگتا ہے۔ پیٹ کا نچلا حصہ بھی عُریاں ہے۔ اور دوسری لڑکی نے جوڑا کو کتنی محنت سے تیار کیا ہے، معلوم پڑتا ہے، اس لڑکی نے اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کو اس خوبصورت جوڑے

ہیں پن ویلف ہے، بالکل اُس محنت کش کشمیری کی طرح، جو اپنے ہاتھوں کی کاریگری سے شال پر ریشم کے پھول کاڑھتا ہے۔

تینوں ایک میز کے گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ اور بیرہ کو آئس کریم کا آرڈر دیتے ہیں۔ اور اُس کا ذہن اپنے گھر کی طرف لوٹتا ہے! اس طرف ایک کمرہ ہے۔ یہاں موچی رہتے ہیں! ایک کمرے میں تقریباً بیس انسان رہتے ہونگے یہ لوگ گھر میں جوتے تیار کرتے ہیں۔ اور بازار میں جا کر بیچتے ہیں۔ ان موچیوں نے شادیاں کی ہوئی ہیں۔ اور انکے بال بچے اس کمرے میں رہتے ہیں۔ یہ سب لوگ سوتے کہاں ہیں۔ انکا ڈرائنگ روم کونسا ہے، انکا مہمان خانہ کونسا ہے، انکا باورچیخانہ کونسا ہے، یہ آرام کہاں کرتے ہیں۔ اسکا مجھے علم نہیں، میں اکثر انکی عورتوں کو دیکھتا ہوں، وہ اکثر دن کے وقت باہر سڑک پر چارپائی ڈال کر بیٹھ جاتی ہیں، اور ایکدوسرے کا سر دیکھتی ہیں، ان کے بچے ننگ دھڑنگ، سڑکوں پر کھیلتے رہتے ہیں۔ بچے کافی کمزور اور دُبلے ہوتے ہیں؛ عورتیں موٹی اور بھدّی ہیں؛ مہینے میں ایک دو بار نہاتی ہیں۔ اُنکے بچے نہ سکول جاتے ہیں، اور نہ ہی ہماری حکومت اُنکا خیال کرتی ہے۔ اگر باپ موچی ہے تو وہ زندگی بھر موچی رہیگا۔ اور اسی کھولی میں زندگی گذار دیگا۔

انکے دروازوں پر جناح کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ کچھ عرصے سے یہ تصویر وہاں سے ہٹالی گئی ہے،

اس کمرے کے ساتھ ایک اور کمرہ ہے، یہاں دس بارہ بھبیا رہتے ہیں کافی ہٹے کٹے اور جوان۔ بالکل صحت مند دکھائی دیتے ہیں، لیکن انکو صفائی کا

خیال نہیں۔ ان میں ہر شخص کا ایک ایک ٹرنک ہوتا ہے، وہاں انکی زندگی کا سرمایہ جمع رہتا ہے، کمرے میں ایک رسی لگی رہتی ہے، ان پر اُن کی دھوتیاں لٹکی رہتی ہیں۔ انکی بیویاں کہاں رہتی ہیں؟۔ انکے بچے کہاں ہیں؟۔ ان کی جنسی زندگی کیا ہے؟۔ اسکا مجھے علم نہیں۔ یہ لوگ صبح سویرے اُٹھتے ہیں، اور نہادھو کر چلے جاتے ہیں، دوپہر کو واپس آتے ہیں، اپنے اپنے چولھے پر کھانا تیار کرتے ہیں، کھانا کھاکر اپنا بستر فرش پر لگاتے ہیں۔ اور ایک میلی دھوتی پہن، اس بستر پر آرام کرتے ہیں۔ شام کو یہ بھیا پھر باہر نکلجاتے ہیں، اور رات نجے آٹھ نو بجے واپس آجاتے ہیں!۔ کھانا کھاتے ہیں، اور سو جاتے ہیں!۔ یہ لوگ طوائفوں سے سخت نفرت کرتے ہیں، مسلمانوں کیساتھ مل بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے۔ جب کبھی چودھویں کا چاند نکلتا ہے۔ تو اس بلڈنگ کے تمام بھیا نیچے کے صحن میں جمع ہوتے ہیں، ایک پنڈت کو بُلواتے ہیں، اور اُس سے کتھا کراتے ہیں۔ ایکبار میں بھی اس کتھا میں شامل ہوا تھا۔ نیچے صحن میں بہت گرمی تھی، سنڈاس کھُلے ہوئے تھے، اور بدبو اور تعفن سے ذہن بوجھل ہوگیا تھا۔ عجیب بدبو آتی ہے اُن کے کمروں سے رات بھر رام اور نام کا جاپ ہوتا رہا۔ سیتا اور رام کے قصے ہوتے رہے، راون کو گالیاں ملتی رہیں، اور لکشمن اور سیتا کی تعریف ہوتی رہی،۔ صدیوں سے اس قسم کی کتھائیں ہوتی رہتی ہیں، لیکن ان لوگوں میں ابھی تک صفائی کا خیال پیدا نہیں ہوا۔۔ رام نام کو جپتے ہوئے ٹانگوں کو کھُجلاتے ہوئے، زندگی کے لطیف احساسوں سے بہت دُور۔۔ زندگی کو شروع کرکے پھر اسی گندگی اور بدبو میں مرجاتے ہیں۔۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں۔ کہ ان لوگوں نے کبھی لینن اور سٹالین کا نام نہیں سُنا۔

میرے کمرے کیساتھ ہی ایک اور کمرہ ہے!۔ اسمیں ایک ناچنے والی رہتی ہے، کالی سیاہ فام۔ اسکا باپ کچھ نہیں کماتا۔ اُسکی ماں بوڑھی ہے، اسکے دو چھوٹے بھائی ہیں، اور چار بہنیں ہیں۔۔ صرف بڑی لڑکی کماتی ہے، ناچ کر، لوگوں کے دلوں کو لبھا کر، کولھوں کو مٹکا کر۔ روپے لاتی ہے، اور یہ سب مل بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ باپ کافی ہٹا کٹا ہے، لیکن گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ بوڑھی عورت کو جوان بننے کا بہت شوق ہے، وہ ہمیشہ بھڑکیلے فراک پہنتی ہے!۔ لپ سٹک لگاتی ہے، اور بالوں پر جالی لگا کر بلڈنگ میں گھومتی رہتی ہے۔ جب لڑکی کی آمدنی زیادہ ہوتی ہے، تو یہ لوگ شراب پیتے ہیں، گاتے ہیں، گراموفون پر ریکارڈ سُنتے ہیں!۔ ایکبار یہ لڑکی ایک لونڈے کیساتھ بھاگ گئی تھی، ماں اُسے پھر پکڑ کر لے آئی۔ اب لڑکی پھر یہاں رہتی ہے، جہاں میں رہتا ہوں۔ یہ بہت بڑی بلڈنگ ہے، لیکن یہاں ایک ایک کمرے کا فلیٹ ہے!۔ اس بلڈنگ میں تقریباً پچاس کمرے ہیں۔ ادھر کے ایک کمرے میں پٹھان رہتے ہیں، سب کے سب سُود خور پٹھان،۔ اُنکی زندگی میں صرف ایک دھندا ہے۔ کہ لوگوں کو روپے دینا اور ڈنڈے اور مار پیٹ سے سُود لینا۔ یہ دفتر کے کلرکوں اور مل کے مزدوروں کو سُود پر روپیہ دیتے ہیں!۔ پاکستان کے بننے سے پہلے انکا کافی رعب تھا، لیکن اب حالات بدل چکے ہیں،۔ اب وہ اکڑفوں نہیں،۔ یہ لوگ بھی موقعہ کی نزاکت کو سمجھ کر خاموش ہو گئے ہیں لیکن

سُود لینے کا چسکا اسقدر پڑا ہوا ہے۔ کہ وہ اس دھندے کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اس بلڈنگ میں پہلے مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی، اب مسلمان آہستہ آہستہ جا رہے ہیں، اُنکی جگہ سندھی اور پنجابی آ رہے ہیں۔ پنجابی اور پٹھانوں کی اکثر ٹھن جاتی ہے،۔ لوگ انہیں گالیاں دیتے ہیں۔ اور یہ لوگ خاموشی سے گالیاں سُنتے ہیں۔ روپیہ کا لالچ انسان کو کتنا ذلیل کراتا ہے!۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اسکا احساس کیا۔

اور اس کمرے سے ذرا آگے بڑھو۔ تو آپکو ایک بوڑھی طوائف کا کمرہ ملیگا۔ چالیس کے قریب ہوگی یہ طوائف۔ اٹھارہ برس سے یہ عورت اس جگہ پیشہ کرا رہی ہے، لیکن بن ٹھن کر رہنے کی آرزو ابھی تک کُند نہیں ہوئی ہے۔ ایک بوہری اسے مستقل ۲۵۰ روپیہ ماہوار دیتا ہے۔ وہ یہاں کبھی نہیں آتا، بلکہ یہ خود مہینے میں ایکبار اُسکے پاس چلی جاتی ہے!۔ اس طوائف نے ایک چھوکرا رکھا ہوا ہے، اُسے کھانا کھلاتی ہے، کپڑے سِلا کر دیتی ہے، جیب خرچ دیتی ہے، اُسکی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہے، یہ چھوکرا دن بھر گھر میں رہتا ہے، خود شراب پیتا ہے، اور جوان چھوکریوں کو تاڑتا ہے، موچیوں سے عشق کرتا ہے، اور بیہودہ فلمی گیت گاتا ہے!۔

یہ چھوکرا شام کے وقت سامنے والی سڑک پر۔ نہا دھو کر، ایک چمکیلی قمیص اور ایک پینٹ پہن کر کھڑا ہو جاتا ہے!۔ بالوں کو ماتھے پر پھسلا کر، بڑے مزے سے سگرٹ کے کش لگاتا ہے۔

اب تو میری آئس کریم تھوڑی سی رہگئی ہے، شاید سوچتے سوچتے جلدی

کھا گیا ہوں۔ وہ انگریز جوڑا ابھی تک باتیں کر رہا ہے، اور دو عورتیں اور ایک مرد والی میز تو اب خالی ہو چکی ہے۔ اب اسکی جگہ دو یورپین عورتوں نے لیلی ہے، دونوں عمر رسیدہ دکھائی دیتی ہیں، گردن کا گوشت لٹک گیا ہے۔ جب مسکراتی ہیں، جھریاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ انھوں نے اپنے سروں پر سرخ رنگ کے رومال پہنے ہوئی ہیں، اور انکی لمبی لمبی باہیں، جن پر بڑھاپے کی چھاپ لگی ہوئی ہے، وہ زمین پر عجیب سا دباؤ ڈال رہی ہیں، وہ بار بار آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی ہیں، اور اپنے بیگ سے لپ سٹک نکالکر ہونٹوں پر لگاتی ہیں، اور بار بار چہرے کو پف سے صاف کرتی ہیں لیکن کمبخت بڑھاپا۔ اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتا!۔ اتنا پوڈر۔ لپ سٹک لگا کر بھی بڑھاپا اپنے پورے جوبن پر ہے، چھپائے نہیں چھپتا۔ وہ بار بار سیڑھیوں کی طرف دیکھتی ہیں!۔ شاید انھیں کسی کا انتظار ہے۔ اس عمر میں گاہک کا انتظار کرنا کتنا ناموزوں دکھائی دیتا ہے!۔ میری نگاہیں اس میز سے ہٹ جاتی ہیں!۔ اور ذہن پھر اپنی بلڈنگ کی طرف زقند لگاتا ہے، اور ایک آرٹسٹ کے کمرے کی طرف لے جاتا ہے! اس آرٹسٹ کا عجیب و غریب کمرہ ہے، کمرے میں ننگی عورتوں کی تصویریں ہیں!۔ سامنے کی میز پر ایک ننگی عورت کا بت ہے!۔ جسکے جسم کے خطوط واقعی دلکش ہیں!۔ آرٹسٹ نے اس مجسمہ پر ایک جالی دار کپڑا چڑھا دیا ہے، اس نے ایک بدصورت عورت سے شادی کی ہوئی ہے!۔ وہ عورت کو اپنے گھر میں نہیں لاتا!۔ آجکل وہ حاملہ ہے، اسلئے اس نے اسے ایک ہسپتال میں داخل کیا ہوا ہے!۔ یہ آرٹسٹ پردوں پر تصویریں بناتا ہے۔ قلم

کمپنیوں کے سٹینگ، سینری تیار کرتا ہے!۔ دن رات شراب پیتا ہے۔
اور اکسٹرا لڑکیوں سے عشق کرتا ہے!۔

اور کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، کہ اس بلڈنگ کے رہنے والوں میں
ایک ایسا آدمی نہیں!۔ جو خوبصورت ہو۔ جسے خوبصورت کپڑے پہننے کا
ہو، جو ایک کمرے کی بجائے، ایک ہوادار مکان میں رہنے کا متلاشی ہوا۔
اس بلڈنگ میں ایک ایسا آدمی بھی نہیں، جو مارکس کے نام سے واقف ہو
جو لینن کو جانتا ہو!۔ ایسے آدمی ضرور ہیں، جو گاندھی اور جواہر لعل کے نام سے
واقف ہیں لیکن انھیں یہ معلوم نہیں، کہ گاندھی نے ہندوستان کے لئے
کیا کیا!۔ صرف اندھی عقیدت ہے۔ اور کچھ نہیں!۔ گاندھی کو کیوں قتل کیا گیا
اسکا کسی کو علم نہیں!۔ اکثر ان لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں، جب یہ
لوگ "باپو کی امر کہانی" کا ریکارڈ سنتے ہیں — لیکن ریکارڈ سنکر رو دھو کر،
کھانا کھا کر، ایک میلی سی دھوتی پہنکر، یہ لوگ سو جاتے ہیں!۔ ان لوگوں نے
نہ ٹیگور کا نام سنا ہے نہ اقبال کا — نہ پریم چند کو جانتے ہیں، نہ کرشن چندر کو
یہ لوگ نہ اچھا کھانا کھاتے ہیں، نہ اچھا کھانے کا خیال کرتے ہیں، —
یہ لوگ شاید ادھر نہیں آتے۔ اس علاقے کی طرف، جو چرچ گیٹ سے
شروع ہوتا ہوا، مالا بار ہل کی طرف چلا جاتا ہے، یہ علاقہ جہاں خوبصورت
فلیٹ ہیں، بڑی بڑی شاندار کوٹھیاں ہیں!۔ یہ علاقہ جہاں میٹرو ہے، جہاں
پیرسن ڈیری ہے!۔ جہاں ہوٹل وڈ لیمار ہے۔ یہ لوگ ادھر آنے کی تمنا کیوں

نہیں کرتے، کیوں اپنے بلوں میں دن رات گھسے رہتے ہیں، یہاں سجی ہوئی دوکانیں ہیں!۔ چمکتا ہوا فرش ہے!۔ صاف اور شفاف ہوا ہے۔ گندگی اور بُو کا نام نہیں!۔ کمرے صاف اور چمکدار ہیں!۔ ادھر ڈرائنگ روم ہے اُس میں صوفہ سیٹ ہے، سنگار میز ہے!۔ یہ آرام کرنے کا کمرہ ہے! یہ سپرنگ دار پلنگ ہے!۔ یہ ریشم کے تکیے ہیں!۔ یہ ریشم کی چادریں ہیں! یہ رنگین پردے ہیں!۔ اور یہ کھانے کا کمرہ ہے! یہ پرچیں ہیں!۔ یہ پیالیاں ہیں!۔ یہ ڈنر سٹ ہے!۔ یہ ٹی سٹ ہے!۔ یہ کرسیاں ہیں!۔ میزیں ہیں!۔ تپائیاں ہیں!۔ اور یہ سنڈاس صاف اور ستھرا!۔ یہ نہانے کا ٹب!۔ یہ شاور باتھ!۔ یہ الیکٹرک مشین!۔ یہ جگہ!۔ یہ کمرے!۔ یہ عورتیں!۔ یہ مرد!۔ اور یہ کاریں!۔ یہ سب خوبصورت ہیں!۔ ان کے پاس لاکھوں روپے ہیں! انھیں کل کی فکر نہیں ہوتی!۔ ان کے لڑکے انگلینڈ اور پیرس میں تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں!۔ ہوا تبدیل کرنے کے لئے سوئٹزرلینڈ جاتے ہیں!۔ اور اگر کبھی بیمار ہو جائیں، تو دو دو نرس بلاتے ہیں!۔ اور اس دوران میں اگر کسی نرس سے آنکھ لڑ جائے، تو مرض پھر درست نہیں ہوتا!۔ نرس بھی گھر میں اور مریض بھی گھر میں!۔ ان لوگوں کی بیویاں ہوتی ہیں — اور ساتھ ہی دوسری عورتوں کے ساتھ ان کے معاشقے بھی ہوتے ہیں!۔ دھرم کا بھی اور ادھرم کا بھی،۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں!۔ یہ لوگ ہمیشہ اچھا کھانا کھاتے ہیں!۔ اسی لئے ان کے چہروں پر تازگی ہوتی ہے، نگاہوں میں زندگی ہوتی ہے!۔ چالاکی ہوتی ہے!۔ عیاری ہوتی ہے!۔ اسی لئے یہ لوگ دوسروں کو

اپنی محفل میں شریک نہیں ہونے دیتے !۔ صرف اپنے لئے کماتے ہیں ، خود کھاتے ہیں ، اور عیش کرتے ہیں ،۔۔۔۔

اب تو میری آئس کریم واقعی ختم ہوگئی ہے !۔ آئس کریم کا آخری پگھلا ہوا قطرہ میں نے حلق میں ڈال لیا ہے !۔۔ میں اکثر ادھر آجاتا ہوں ،۔۔ اب تو یہاں خوبصورت عورتوں کا جمگھٹا ہے !۔ خوبصورت مردوں کا جمگھٹا ہے !۔ خوبصورت تصویریں ،۔۔ کو دیکھ کر اُمید وبیم کی لہریں ذہن میں دوڑنے لگتی ہیں ،۔۔

اور کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں !۔ کہ جس جگہ میں رہتا ہوں ، کیا اُس بلڈنگ کے لوگ یہ زندگی نہ دیکھ سکیں گے ۔ کیا وہ لوگ انسان نہیں ۔ ان میں اور اُن میں کیا فرق ہے !۔ کیا وہ اس طرح ان عالیشان محلوں میں نہیں رہ سکتے !۔ کیا انھیں اس طرح رہنے کا حق نہیں ،۔ اسی احساس کے زیر اثر میں سیڑھیاں اُترنے لگتا ہوں !۔ اور جلدی جلدی قدم اُٹھاتا ہوا ہجوم میں گم ہوجاتا ہوں ،

خالی جیب

صفحات :- ۲۰

آج وہ! تھوڑے سے پیسے ایک دوست سے مانگ کر لایا تھا۔
بس کا کرایہ دیا تھا، اور وہ پہلے خرچ ہو گئے تھے۔ اُسکا دل چاہ رہا تھا۔ کہ وہ
کسی اچھے سے ریستوران میں بیٹھ کر چائے پیے۔ کیک اور بسکٹ کھائے
اور خوبصورت لڑکیوں کو جی بھر کر دیکھے!۔ وہ سوچتا گیا۔ اور ساتھ ہی اُسکے
قدم سڑک پر اُٹھتے گئے!۔ شام کے چھ بج چکے تھے!۔ اور مغرب میں آفتاب
اپنی کرنوں کو سمیٹ کر سمندر میں ڈوب چکا تھا!۔ ہوا کچھ ٹھنڈی ٹھنڈی
تھی!۔ سڑک سیدھی اور شفاف تھی!۔ سڑک کے دونوں طرف فلک بوس
عمارتیں کھڑی تھیں۔ اور لوگ جوق در جوق ادھر اُدھر خراماں ٹہل رہے تھے،
وہ سڑک پر چل رہا تھا۔ اور خیالات دماغ میں چکر لگا رہے تھے، ——
کیا ہی اچھا ہو —— کہ اُنکا کوئی پُرانا واقف کار مل جائے!۔ اور اُسے ایک

ریستوران میں لے جا کر گرم گرم چائے پلائے ،۔ گرم گرم چائے ،۔ اور ادھر اُدھر کی گپیں ،۔ ان چیزوں سے ذہنی سکون ملتا ہے ،۔ تلخی کم ہوتی ہے، اور زندگی میں برداشت کا مادہ بڑھتا ہے ،۔ اسی اُمید و بیم میں وہ ایک مشہور ریستوران کے قریب پہنچ گیا ! ۔ قریب سے ایک خوش باش جوڑا گذرا ہوا عطر اور خوبصورتی سے معطر ہو گئی ،۔ وہ کافی عرصہ ان دونوں کی طرف دیکھتا رہا ۔ حتےٰ کہ وہ دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے ۔ وہ اب ایک مشہور ریستوران کے اندر پہنچ چکا تھا ۔ لوگ کرسیوں پر تشریف فرما تھے ۔ یہ عجیب سے لوگ تھے ۔ جنھیں نہ روزی کی فکر تھی ، نہ بھوک کی جنھیں نہ کرایہ کی فکر تھی نہ لانڈری کے پیسوں کی ! ۔ جنھیں نہ گھر کے کرایے کا خیال تھا ۔ نہ آئندہ ہفتے کے راشن کا دھیان ،۔ سامنے کرسیوں پر دو انگریز عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں ،۔ دونوں ادھیڑ عمر کی تھیں ، لیکن لبوں پر بلا کی سُرخی تھی ۔ ، گالوں پر غازے کی ایک موٹی تہ جمی ہوئی تھی ،۔ اور آنکھوں کی بھویں تن کر کمان بن چکی تھیں ،۔ چہرے پر غازے کی وجہ سے جُھرّیاں عنقا تھیں ! ۔ لیکن گردن پر جُھرّیوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا ۔ دونوں سگرٹ پی رہی تھیں ، اور فضا میں دُھویں کو تحلیل کر رہی تھیں ،۔ اُس نے ان دونوں کی طرف دیکھا ،۔ اس بُڑھاپے کے باوجود ۔ دونوں میں زندہ رہنے کی کتنی خواہش تھی ،۔ اس بڑھاپے نے ان کی خواہشوں اور اُمنگوں کو بوڑھا نہ بنایا تھا ۔ عالمِ شباب کے گذر جانے کے بعد بھی ، ۔ وہ زندگی سے پورا لطف اُٹھانا چاہتی تھیں ،۔ اتنے میں ایک موٹا سا انگریز

اُن کی کرسیوں کے قریب آکر بیٹھ گیا —— دونوں ہنس پڑیں، ——
اور زندگی کی رفتار اور تیز ہو گئی۔

وہ کرسی پر بیٹھا ہوا ہی سوچ رہا تھا۔ کہ اُس کا پُرانا واقف کار مل جائے،۔ تو آج شام اچھی گذر جائے۔ وہ اُس سے باتیں کرے گا اپنی پھوٹی قسمت کا رونا روئے گا۔ اور گرم گرم چائے پیئے گا۔ اب تو ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی ا— اور اندھیرا زیادہ ہو گیا تھا۔ بجلی کی روشنی میں چہرے اور زیادہ نمایاں ہو گئے تھے۔ لوگ اپنی کہنیاں میزوں پر رکھے ہوئے، میزوں پر جھکے ہوئے باتیں کر رہے تھے،۔ چائے پی رہے تھے، ہنس رہے تھے، اور زندگی سے پورا حظ اُٹھا رہے تھے۔

اُس کی نگاہ پھر کرسیوں کو تلاش کرنے لگی،۔ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے انسانوں کو دیکھنے لگی،۔ یہ انسان کتنے بے رحم ہیں،۔ جو اُسے بلاتے ہیں، جو یہ نہیں سمجھتے،۔ کہ یہ شخص بھی صرف ایک کپ چائے کا متلاشی ہے لیکن اُسکی رونی صورت کو دیکھ کر کسی کو رحم نہ آیا،۔ اور اُس کی نگاہ ایک تھکے ہارے ہوئے مسافر کی طرح، قریب والی میز پر جم گئی۔ —— ساتھ والی میز پر ایک مرد اور دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں،۔ مرد کی عمر ہو گی بیس بائیس برس، —— عورتوں میں ایک جوان تھی اور دوسری بوڑھی دونوں کے آگے سٹرابیری کی پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں —
اُس نے پہلے سٹرابیری کی پلیٹ کی طرف دیکھا،۔ اور پھر

لڑکی کی طرف۔ لڑکی کے نقش تیکھے اور دلفریب تھے۔ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے،۔ آنکھیں نیلی نیلی،۔ نگاہوں میں شوخی اور بے باکی، ٹھوڑی لمبوتری تھی،۔ رنگ گندمی،۔ چہرے کی بناوٹ میں ایک کشش تھی، ـــــ وہ کافی عرصے تک اُس کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتا رہا۔ جب سٹرابیری کی پلیٹ ختم کر چکی۔ تو اُس نے فروٹ کریم کا آرڈر دیا، ـــــ اتنے میں ایک بیرہ اُس کے قریب آگیا۔ بیرے کو دیکھ کر وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ اپنی عزت کو بچانے کے لئے اُس نے ایک چائے کا آرڈر دیا،۔ بیرے نے ایک لمحہ گھور کر اُس کی طرف دیکھا،۔ اور پھر مسکراتا ہوا چلا گیا۔ کمبخت پہچان گیا تھا ـــــ کہ بابو صرف لڑکیاں دیکھنے ادھر آیا ہے،ـــــ در اصل وہ لڑکیاں دیکھنے نہ آیا تھا۔ بلکہ اُس کا جی چاہ رہا تھا۔ کہ وہ آج جی بھر کر کھانا کھائے،۔ اچھا لذیذ کھانا، ـــــ کئی دنوں سے وہ دال اور چاول کھا رہا تھا۔ متواتر دال چاول کھانے سے اُس کا پیٹ خراب ہو چکا تھا ـــــ اکثر پیٹ میں درد ہوتا تھا۔ اُس نے ڈاکٹر سے مشورہ لیا تھا لیکن وہ ڈاکٹر کے مشورے پر کس طرح عمل کرتا ـــ ڈاکٹر نے اُسے بتایا تھا۔ کہ وہ مچھلی، گوشت اور انڈوں کا بکثرت استعمال کرے، لیکن ان چیزوں کے لئے روپے چاہیئیں۔ وہ آٹھ ماہ سے بے کار تھا در اصل وہ اُن بے کاروں میں سے تھا جو کام کرنا گناہ سمجھتے ہیں، بلکہ اُن بے کاروں میں سے تھا کہ جو کام کرنا چاہتے ہیں۔ ـــــ

لیکن جنھیں کام نہیں ملتا ۔۔۔ جب سے ہندوستانیوں کو آزادی ملی ہے، بے کاری اور بھوک زیادہ بڑھ گئی ہے ۔۔ جس جگہ جاؤ کام نہیں ہے کام نہیں ہے کی آوازیں آتی ہیں ۔۔ امیروں نے روپوں کے دروازے بند کر دیئے ہیں ۔ اس وقت وہ تجارت میں روپے لگانا نہیں چاہتے ۔ اُن سے پوچھو ۔ بھائی کیا بات ہے ۔ تو فوراً جواب دیں گے ۔۔ کہ بھائی کشمیر کی جنگ شروع ہے ۔ روپے کیسے لگادیں ۔ ان کم بختوں سے کوئی یہ نہیں پوچھتا ! ۔ کہ اگر کشمیر کی لڑائی بند ہوگی ۔ تو حیدر آباد کی لڑائی شروع ہو جائے گی ! ۔ اور اگر ہندو مسلم کی لڑائی ختم ہوگئی ، تو ریاستوں کی لڑائی شروع ہو جائے گی ۔ اور اگر یہ سب لڑائیاں بند ہو جائیں ۔۔ تو کانگرس اور کمیونسٹوں کی جنگ شروع ہو جائے گی ۔۔ جو در اصل شروع ہو گئی ہے وہ سوچتے سوچتے چائے پینے لگا ۔ اور چائے پیتے پیتے ۔۔ لڑکی کی طرف دیکھنے لگا ۔۔۔ اور لڑکی کی طرف دیکھتے دیکھتے پھر سوچنے لگا ۔۔ کہ وہ چائے کے پیسے کس طرح دے گا ! ۔ اُس نے سوچا ۔ کہ وہ آنکھ بچا کر بھاگ جائے گا ۔۔۔ اگر بیرے نے پکڑ لیا ۔ ۔ تو یہ خوبصورت لڑکی کیا کہے گی ! ۔۔ یہ لڑکی بار بار اُس کی طرف کیوں دیکھ رہی ہے ؛ ۔۔۔ اللہ کرے پھنس جائے ۔۔ کسی امیر خاندان کی معلوم ہوتی ہے ۔۔ اگر یہ لڑکی اُس سے عشق کرنے لگے ، تو واقعی زندگی کا مزا آجائے ۔۔ وارے کے نیارے ہو جائیں ! ۔ کسی عالی شان کوٹھی میں رہتی ہوگی ! ۔ فروٹ کریم کھا کر اب سموسے کھا رہی ہے ! ۔۔۔ لوگ کہتے ہیں ، کہ بمبئی

میں لڑکیاں لڑکوں کو اپنے پاس رکھتی ہیں، یعنی لڑکیاں کماتی ہیں، اور لڑکے کھاتے ہیں۔ آج اُس کے اخلاق کی گرفت ڈھیلی ہو رہی تھی، اُس کا جی چاہ رہا تھا۔ کہ کوئی لڑکی اُسے کار میں بٹھا کر کسی ریستوران میں لے جائے، اور بھونا ہوا مرغ کھلائے، پلاؤ کھلائے، اور قورما کھلائے اور وسکی پلائے، اور اُس کے فروٹ کریم کا ایک بھرا ہوا ٹھنڈا گلاس، — اور پھر مائی ڈارلنگ کہتی ہوئی، اُس کے گرد اپنے ریشمی بازو حمائل کر دے، ـــــ

اتنے میں بیرہ آگیا۔ اور اس نے بل پیش کیا! بل دیکھ کر وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ پیشانی پر قطرے نمودار ہو گئے! اس نے بیرے کی طرف دیکھا، اور پھرتی سے بل پکڑ کر چائے کی طشتری کے نیچے رکھ لیا اور بیرے سے کہا "ذرا ٹھہر کر آنا"۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ یہ لڑکیاں یہاں سے چلی جائیں! خاص کر یہ لڑکی، جو اس کی طرف دیکھ رہی ہے! اس کی طرف دیکھ رہی تھی، یا اس کی میز کی طرف! جس پر صرف ایک پیالی تھی! اور وہ بھی خالی! اس کی جیب کی طرح، لڑکی نے بٹوہ سے آئینہ نکالا! اور اپنا چہرہ دیکھنے لگی! لبوں کی سرخی ہلکی پڑ چکی تھی! اُس نے بٹوے سے لپ سٹک نکالی۔ لبوں پر لپ سٹک کو پھیرا۔ پہلے نچلے ہونٹ پر لپ سٹک کو پھیرا۔ اور پھر اوپر کے ہونٹ پر۔ پھر دونوں ہونٹوں کو پھیلایا، اور اپنی انگلی سے سُرخ رنگ کو جمایا، لبوں پر زبان پھیری، لب کو لب سے ملایا، اور چہرے کو پوڈر سے ڈسٹ کیا، پیشانی

زُلف کو درست کیا۔ اور پھر نہایت سنجیدگی سے آئینے کو بٹوے میں ڈال لیا۔ اب چہرہ زیادہ خوبصورت ہوگیا تھا۔۔ سٹرابیری فروٹ کریم، ہمو نے نے مل کر، چہرے پر ایک عجیب دلآویزی بکھیر رہی تھی۔۔ آنکھوں میں خود اعتمادی کی جھلک تھی۔۔ سر کو جھٹکا دیا۔۔ اور بال لرزتے، کانپتے ہوئے شانوں پر بکھر گئے!۔۔ دور، اس ریستوران سے پرے، رات اور سیاہ ہوتی گئی۔۔۔ یہ سیاہی بھی عجیب چیز ہے!۔ یہ زلفیں بھی عجیب چیز ہیں۔۔ یہ چہرہ بھی عجیب ہے۔۔ یہ سٹرابیری بھی عجیب ہے۔۔

وہ اس بھوک کو مارنا چاہتا تھا۔۔ لیکن یہ اور بڑھتی جارہی تھی۔۔۔ رات اپنی تاریکیاں لئے ہوئے، ذہن میں گھسی چلی آرہی تھی۔۔۔ اُس نے پھر لڑکی کی طرف دیکھا۔۔۔ لڑکی مُسکرائی اور اپنی بوڑھی اماں کے ساتھ ریستوران سے باہر نکل گئی۔

اتنے میں قریب والی کُرسی پر اُس کا پُرانا دوست آدھمکا۔ اُسے دیکھ کر اُس کی جان میں جان آئی۔۔ اُس کے دوست کا نام شام تھا۔ شام نے اُس کی طرف دیکھا۔ اور کہنے لگا:۔۔

'کہو بیٹا کیا حال ہے؟'

'بہت بُرا حال ہے'

'کوئی کام ملا'۔

'برابر آٹھ مہینے سے بے کار ہوں۔۔ غضب ہوگیا ہے۔۔ کام ہی نہیں ملتا۔۔ سچ کہتا ہوں شام۔ اگر کچھ دن اور کام نہ ملا، تو

میں واقعی پاگل ہو جاؤں گا'

'پاگل ہونے سے تو کام نہیں چلے گا' شام نے گولڈ فلیک کے ڈبے سے ایک سگریٹ نکالا۔ اور سلگاتے ہوئے کہنے لگا۔

'یہاں، اس بمبئی میں ہم لوگوں نے فاقے کئے ہیں۔ دس دس میل پیدل چلا ہوں، ٹرین کا کبھی ٹکٹ نہیں خریدا تھا۔ فٹ پاتھ پر سویا ہوں۔ اور فلم کمپنیوں کے چکر لگا لگا کر ذہن میں ایک زہر سا بھر گیا تھا۔ لیکن دوست، ہم نے ہار نہیں مانی۔ برابر چکر کاٹتے رہے اگر کام نہیں ملا، جب بھی جاتے رہے ___ اُن دنوں دوست، ایک لونڈیا ہم پر مرمٹی تھی، ___ اُس بے چاری نے لاج رکھ لی۔ نہیں تو ہم کب کے یہاں سے رفو چکر ہو گئے ہوتے۔ بیچاری نے بڑی خدمت کی۔ جب کبھی جیب میں پیسے نہ ہوتے۔ اُس کے گھر چلے جاتے، ___ وہ کھانا کھلاتی۔ چائے پلاتی، اور جب ہیں کمرے سے باہر نکلنے لگتا۔ تو پانچ کا نوٹ ہاتھ میں دے دیتی۔ بات دراصل یہ ہے دوست۔ کہ بمبئی کے مرد تو نرے چغد ہیں۔ یہاں کی عورتیں نر ہیں، نر ___ اگر میاں زندہ رہنا ہو، تو کسی لڑکی کو پھانس لو۔ ___ نہیں تو، بھائی جُمن۔ یہاں سے دال نے عین ہو جاؤ ___ سگریٹ پیو گے' اور شام نے سگریٹ کا ڈبہ اُس کے سامنے رکھا۔ اُس نے ایک سگریٹ نکالا۔ اور بڑے مزے سے سلگایا۔

اور پھر نہایت دھیمی آواز میں کہا۔

'شام'

'کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔ رُک کیوں گئے ہو۔'

'بھائی۔ چائے کے پیسے تم دینا۔ میرے پاس اس وقت پھوٹی کوڑی بھی نہیں!'

'اگر جیب میں پیسے نہ تھے۔ تو ریستوران میں کیوں داخل ہوئے تھے۔'

'ایک بار بھول ہو گئی۔ اب دوبارہ کبھی نہ آؤں گا۔'

'اچھا جاؤ۔ میں بل ادا کر دوں گا۔'

اور وہ اُس کے کہنے پر چلا گیا۔ دراصل وہ جانا نہ چاہتا تھا۔ لیکن شام کے بولنے کے انداز میں ایک عجیب تمکنت تھی۔ ایک ایسا لہجہ تھا، جس میں حقارت تھی۔ جو یہ کہہ رہا تھا۔ کہ۔" میاں۔ میں تم سے بڑا ہوں۔ دیکھو یہ میرے ہاتھ میں سگرٹ کا ڈبہ ہے، جیب میں دس بیس روپے ہیں۔ اور ایک نہایت نفیس سوٹ زیب تن کئے ہوئے ہوں، ایک اچھے فلیٹ میں رہتا ہوں۔ اور تم کیا ہو۔ ایک ناکامیاب انسان۔ جو بغیر پوچھے اس عالی شان ریستوران میں گھس آئے۔ اور چائے کا آرڈر دے کر اس بات کا انتظار کرتے ہیں، کہ ہمارا کوئی پُرانا واقف کار مل جائے، تاکہ اُس سے چائے کے پیسے وصول ہو جائیں، دیکھ بھیّا، دوسروں

کی جیب پر ڈاکہ ڈالنا ٹھیک نہیں، آج تو پیسے ادا کر دیئے، بار بار
میں تمہارے بل ادا نہ کر سکوں گا۔"

اُس نے ساتھ والی میز پر نگاہ ڈالی، لڑکی جا چکی تھی، میز اُسی
طرح صاف تھی۔ میز پوش اُسکی طرف پریشان نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

وہ ریستوران سے باہر نکل گیا۔

اب اندھیرا گہرا ہو گیا تھا! دور صورتیں نظر نہ آتی تھیں لیکن
لوگ جوق در جوق آ رہے تھے، جا رہے تھے، خوب صورت مرد،
بدصورت مرد، بدصورت عورتیں، خوب صورت عورتیں، بوڑھے
پارسی، جوان ہٹے کٹے پنجابی، موٹے اور بھدّے گجراتی، —
ٹھگنے مراہٹے۔ سبھی، اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے، سامنے کے
ہوٹل میں عجیب سی کشش تھی، باہر اندھیرا تھا! اندر جگمگاہٹ
تھی، کرسیوں پر مختلف اقسام کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے،
اُن کے چہرے تمتماتے ہوئے تھے، اُن کی آنکھیں شعلہ افشاں
تھیں، اُن کی رگوں میں خونِ آتشیں سیال کی طرح گھوم رہا تھا، —
اُن کی نگاہیں انگاروں کی طرح سُرخ تھیں، کچھ جوان لڑکیاں بھی تھیں،
انگلو انڈین زیادہ اور ہندوستانی کم، جو ہندوستانی تھیں، اُن کی عمر پکی
تھی، وہ عالمِ شباب کو خیرباد کہکر، اس ہوٹل میں شباب کو از سرِ نو زندہ کرنے
آئی تھیں، اور جو لوگ اس ہوٹل میں موجود تھے، اُنھوں نے روپیہ بلیک
مارکیٹ سے کمایا تھا، یا ابھی تک کما رہے تھے، وہ ملوں کے مالک تھے، وہ ہوٹلوں کے مالک تھے،

وہ فیکٹریوں کے مالک تھے!۔وہ عالیشان عمارتوں کے مالک تھے!۔وہ لاکھوں کے مالک تھے کروڑوں کے مالک تھے!۔سیمنٹ کے مالک تھے، لوہے کے مالک تھے، نمک کے مالک تھے، تیل کے مالک تھے کپڑے کے مالک تھے!۔ہوائی جہازوں کے مالک تھے!۔انھیں کل کی خبر نہ تھی!۔آج کی خبر نہ تھی، صرف اس وقت کی خبر تھی!۔اس لمحہ کی فکر تھی!۔اس صورت کی فکر تھی!۔ان آنکھوں کے شیدائی تھے، اس کمر پر فدا تھے!۔ان نیلی نیلی آنکھوں پر بنڈلوں نوٹ قربان ہو جاتے تھے، ان چھاتیوں پر! جنکو مصنوعی ترکیب سے ابھارا گیا تھا!۔فدا تھے!۔مزدوروں کی روزی رک جائے، فیکٹریوں کے کلرک بیکار ہو جائیں!۔مزدوروں کی روٹیاں بند ہو جائیں، کارخانے تباہ ہو جائیں!۔لیکن، ہائے۔یہ کمر۔یہ خم۔یہ دلنواز خطوط۔یہ پتلے پتلے ہونٹ!۔اور یہ من لوبھتی ادائیں!۔یہ ترچھے ابرو۔۔۔یہ سب برقرار رہیں۔یہ خم پھر کب ملے گا۔یہ مدھ بھری ہنسی!۔یہ آنکھوں کی چمک!۔یہ بال۔یہ جوڑا!۔۔جس میں چنبیلی کے پھولوں کی ساری مہک اکٹھی ہو گئی تھی!۔لیکن اسوقت جسم میں شراب تھی!۔جیب میں نوٹوں کی گڈی تھی!۔اور اس ہوٹل سے دور۔کئی ملیں، کئی فیکٹریاں۔نمک کی کانیں!سیمنٹ کے کارخانے! کپڑے کے کارخانے! تیزی سے کام کر رہے تھے، لاکھوں مزدور پسینے میں شرابور تھے آنکھوں میں جلن تھی!۔ٹانگوں میں تھکن تھی!۔بدن نحیف اور کمزور تھے، چہرے کی ہڈیاں باہر نکل آئی تھیں، لیکن پھر بھی مستعدی سے کام کر رہے تھے!۔اس دن کے انتظار میں!۔جب آنکھوں کی جلن، ٹانگوں کی تھکن، اور چہرے کی کمزوری

دور ہو جائیگی !۔ وہ یہی سوچ رہا تھا۔ کہ ایسا کیوں ہوتا ہے !۔ زندگی صرف ان لوگوں کی کیوں تھی !۔ شراب صرف ان لوگوں کیلئے کیوں وقف تھی !۔ یہ ہوٹل صرف کیوں انکا تھا۔ یہ پردے، یہ ساڑیاں، یہ حسین کانچ کے پیالے، یہ موسیقی یہ قہقہے !۔ یہ دھیمی، دھیمی آوازیں !۔ یہ تیز تنفس !۔ یہ عطر، سینٹ، پوڈر، یہ کریم۔ بسکٹ ! مچھلی ! فروٹ کریم۔ کانٹے، ٹماٹر !۔ یہ سب کیوں انکا تھا !۔ انکے پاس اتنا روپیہ کیوں ہے ؟۔ اور کہاں سے آتا ہے ! اور ملیون تک پھیلی ہوئی مخلوق کیوں بھوکی، ننگی، اور زندگی سے بیزار ہے !۔ وہ یہ سوچ رہا تھا۔

کسی نے اسکے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

"کیا کر رہے تھے یہاں ؟"۔ نووارد نے کہا۔

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں" !۔ اس نے نووارد کو پہچانتے ہوئے کہا۔

"ذہنی عیاشی ہو رہی تھی" - نووارد جسکا نام بخشی تھا !۔ اس نے رومال سے چہرہ کو صاف کیا !۔ اور کہنے لگا۔ "بھائی کام دلاؤ۔ تمھاری قسم بہت بری حالت ہے اس مہینے کا کرایہ دینا ہے۔ اور روٹی کا بل ادا کرنا ہے"!۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر اسکی طرف دیکھا، بخشی واقعی دبلا اور پتلا ہو گیا تھا !۔ اس سے پہلے اُسے تپ دق کا حملہ ہو چکا تھا !۔ ان دنوں بخشی کے والدین کافی متمول تھے، انھوں نے اُسے کسولی بلا لیا، اور کافی روپئے صرف کئے !۔ اچھی خوراک کھلائی !۔ اور چیڑھ کے درختوں کی ٹھنڈی اور صاف ہوا، اسکے پھیپھڑوں میں داخل ہوتی رہی۔ وہ متواتر چھ مہینے، اچھی خوراک کھاتا رہا۔ ہوادار مکان میں رہا۔ اور اپنی ماں اور بہن کی شفقت کے سہارے وہ دوبارہ زندہ ہوا۔ جب وہ واپس بمبئی آیا !۔

تو اچھا خاصا موٹا تازہ ہو گیا تھا۔ لیکن بمبئی کی آب و ہوا راس نہ آئی! زندگی کی کشمکش نے اسے پھر فاقوں پر مجبور کر دیا!۔ وہی نوکری اور روٹی کا چکر۔ بخشی پھر بیمار ہو گیا والدین روپے نہ بھیج سکے!۔ اور کھانسی اور بخار نے پھر حملہ کر دیا،۔ کہنے لگا۔" یار اکیلے میں بچ نہیں سکتا!۔ دن رات محنت کرتا ہوں!۔ افسانے لکھتا ہوں!۔ شعر کہتا ہوں!۔ لیکن کوئی انسان کا بچہ میری طرف دیکھتا نہیں ۔۔۔ یہ دیکھو، افسانوں کا پلندہ یہ ہے، میری آٹھ سالہ زندگی کا نچوڑ۔ انکو میں ایک سو پچاس روپے سے فروخت کرنا چاہتا ہوں، میں ہر شخص کے پاس جا چکا ہوں، لیکن ہر شخص نے اس مسودے کو خریدنے سے انکار کر دیا ہے!۔ بھائی اچھی خاصی اردو لکھتا ہوں۔ ایم اے تک تعلیم پائی ہے!۔ نقادوں نے میرے افسانوں کی تعریفیں کی ہیں، میرے شعروں کو اچھے رسالوں میں جگہ دی ہے!۔ لیکن اس آٹھ سالہ نچوڑ کو خریدنے کے لئے کوئی شخص تیار نہیں!۔ مجھے معلوم ہے، اب کیا ہوگا، میں ہوٹل کا کرایہ ادا نہ کر سکونگا روٹی کا بل نہ دے سکوں گا۔ لہذا مجھے ہوٹل سے جانا پڑیگا۔ کسی دوست کے ہاں کچھ دن پڑا رہوں گا۔ وہ تنگ آکر مجھے نکال دے گا۔ اور پھر میرے دوست کے گھر۔ اور پھر تیسرے دوست کے گھر حتےٰ کہ دوستوں کے گھروں کے دروازے بند ہو جائینگے۔ تب تک میرے جسم کے ہر حصے میں تپ دق کے جراثیم پورا قبضہ کر چکے ہونگے،۔ اور کسی دن تم مجھے کسی فٹ پاتھ پر مرا ہوا پاؤ گے۔

قریب سے ایک لڑکی گذری!۔

بخشی نے حسرت بھری نگاہوں سے اسکی طرف دیکھا،" واہ سبحان اللہ کیا فگر ہے، کیا باڈی ہے!۔ واہ۔ واہ۔ واہ۔ نشہ طاری ہو گیا!۔ بغیر پیئے!۔

ہمارا نشہ بھی تو اسی قسم کا ہے !۔ عورت ہو۔ تو ایسی ہو، میرا مطلب یہ ہے خوبصورت ہو!۔ نہیں تو گائے ہو، بیل ہو، بھینس ہو،۔ ارے بھائی، ہم تو زندگی میں محبت بھی نہ کر سکے !۔ شروع میں جب ہم والدین کے گھر رہتے تھے، تو کافی لوگ دیکھنے کے لئے آتے تھے، ایم۔ اے تک کافی لڑکیاں، ہمیں شریک حیات، بنانے کیلئے ہمارے آگے پیچھے گھومتی رہیں، لیکن ہمارے دماغ میں کوئی ایسا کیڑا گھسا ہوا تھا، کہ سب کو نفی میں جواب دیا !۔ اُن لڑکیوں میں خوبصورت لڑکیاں بھی تھیں، اور مالدار بھی !۔ لیکن اب جب کہ زندگی میں خود روزی کمانے کا موقعہ ملا ہے، تو لڑکی قریب نہیں پھٹکتی !۔ کام تو ملتا نہیں !۔ چہرے پر رعنائی کیسے آئے، سر کے بال اڑ چکے ہیں !۔ اور جسم کی جلد کالی اور سیاہ ہو چکی ہے !۔ اب لڑکی کس طرح اور کیوں ہماری طرف دیکھے !۔ اچھا بھائی، یہ بتاؤ۔ کہ تمھاری جیب میں کتنے روپے ہیں"۔

"ایک بھی نہیں" !۔

"تم بھی میری طرح بھوکے ننگے ہو،۔ اچھا بھائی اجازت دو"، اور وہ کھانستا ہوا آگے بڑھ گیا !۔ رات اور تاریک ہو گئی تھی !۔ فضا میں سیاہی تھی !۔ لیکن مکانوں کے اندر۔ مکانوں کے باہر، اور سڑکوں کے اردگرد بجلی کے قمقمے روشن تھے !۔ ہوٹلوں اور راستوں سے لوگ نکل رہے تھے جا رہے تھے !۔ ان میں خوبصورت بھی تھے اور بدصورت بھی !۔ لیکن چہروں پر خوشی تھی، آنکھوں میں سرور تھا !۔ یہ ہنستے۔ کھیلتے شراب پیتے ہوئے، کاروں میں چڑھ کر اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھے

جارہے تھے !۔

اور وہ سوچ رہا تھا۔ کہ وہ اس وقت کہاں جائے !۔ اسے اس وقت اپنی کھولی یاد آئی !۔ کتنی گندی اور بدبودار جگہ تھی وہ !۔ ایک ہی کمرے میں آٹھ انسان !۔ اور سب کے سب بے کار۔ پڑھے لکھے ہوئے ،۔ لیکن حالات سے مجبور ــــ کریں، تو کیا کریں، کسی کے پاس بس کا کرایہ نہیں ہے، تو کسی نے ہوٹل کے روپئے نہیں دئے !۔ کسی نے لانڈری کا بل ادا نہیں کیا !۔ کوئی پان والے سے ادھار لے کر زندگی گذار رہا تھا۔ تو کوئی، معشوقہ کے بُندے بیچ کر شراب پی رہا تھا !۔ زندگی میں عجیب قسم کی افراتفری تھی !۔ اجتماعی زندگی بسر کرنے کی آرزو نہ تھی !۔ ہر شخص انفرادیت کے خول کو چڑھا کر زندگی گذارنا چاہتا تھا۔ سبھی ایک دوسرے کو گالیاں بکتے تھے، ایک دوسرے کی کمزوریوں کو گنواتے تھے !۔ اور ایک دوسرے پر پھبتیاں کس کر خوش ہوتے تھے ۔۔ سب کے سب اس ماحول سے نالاں تھے !۔ اس بے کاری سے اکتا گئے تھے !۔ اس زندگی سے بے زار تھے !۔

وہ سوچ رہا تھا۔ کہ قریب ایک اخبار والا گذرا۔ اور وہ چلایا "پانچ کمیونسٹ گولی سے اڑا دئے گئے"۔

اُس کے پاس اِس وقت ایک آنہ بھی نہ تھا۔ لیکن وہ سوچنے لگا کہ کمیونسٹ کیوں مارے جاتے ہیں !۔ ہر جگہ مارے جاتے ہیں !۔ اٹلی میں مارے جاتے ہیں، یونان میں مارے جارہے ہیں !۔ فرانس میں مارے جارہے ہیں !

برلن میں مارے جا رہے ہیں، ہندوستان میں مارے جا رہے ہیں، امریکہ میں ہتھکڑیاں لگائی جا رہی ہیں، انگلینڈ میں نفرت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں!۔ یہ کمیونسٹ کون ہیں!۔ یہ کیا چاہتے ہیں!۔ کیا یہ کوئی اکالی سینا بنانا چاہتے ہیں، رضا کاروں کی فوج تیار کرنا چاہتے ہیں!۔ یہ ہندوؤں کے طرفدار ہیں، مسلمانوں کے یا سکھوں کے۔ یہ کن کے حقوق کے لئے لڑتے ہیں!۔ یہ جناح کی ٹوپی کو بند کرتے ہیں،۔ یا گاندھی ٹوپی کو ـــــ

دراصل وہ چاہتے ہیں!۔ــ وہ کیا چاہتے ہیں؟ــ وہ یہ چاہتے ہیں ـــ کہ ہر شخص کو کام ملے!۔ اس ملک میں لاکھوں انسان بے کار ہیں!۔ وہ بے کاری دور کرنا چاہتے ہیں!۔ اس ملک میں لاکھوں انسانوں کو تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا نہیں ملتا!۔ وہ سب کو کپڑا دینا چاہتے ہیں!۔ اس ملک میں لاکھوں انسان بھوک سے مر جاتے ہیں، وہ سب کو کھانا دے کر زندہ رکھنا چاہتے ہیں!ــ اب تو ہمارا راج ہے، ہماری حکومت ہے، جو چاہیں کر سکتے ہیں!۔ یہ زمین ہماری ہے، کھیت ہمارے ہیں، دریا ہمارے ہیں، سمندر ہمارے ہیں!ــ ہم ایک نیا نظام بنا سکتے ہیں! ایک نئی زندگی تعمیر کر سکتے ہیں!۔ ایک ایسا نظام، جہاں بلیک مارکیٹ نہ ہو، جہاں چیزوں کے بھاؤ بڑھانے کا حق سرمایہ داروں کو نہ ہو، لوگوں کو رہنے کے لئے صاف اور ستھرے مکان ملیں گے ــ سنا ہے، کمیونسٹ بھی کچھ چاہتے ہیں!ــ تو یہ بری بات نہیں ہے!۔ پھر یہ لوگ مارے کیوں جاتے ہیں! کیوں جیل میں ٹھونسے جاتے ہیں!۔ اس میں گورنمنٹ

کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے، ہمارے نیتا ان چیزوں کے کیوں خلاف ہیں۔۔ یہ لوگ کیوں نہیں دیکھتے، کہ جنتا بھوکی مر رہی ہے!۔ وہ ننگی ہے کپڑا نہیں، مکان نہیں، بیماری کے لئے دوائی نہیں!۔۔ اور ادھر یہ ہوٹل یہ شاندار ہوٹل ۔ یہ لذیذ کھانے!۔ یہ ریشمی پردے، حنائی انگلیاں!۔ عطر اور سینٹ کی لپٹیں، خوبصورت عورتیں!۔ خوبصورت مرد، ــــ

اور وہ یہ سوچتا ہوا۔ آگے بڑھتا گیا، قریب ایک مزدور گذرا۔ اس کے ہاتھ سے وہ ٹکرایا!۔ مزدور نے اسے گھور کر دیکھا، اور پھر مسکرا کر آگے بڑھ گیا! یہ مزدور اتنا کمزور نہ تھا!۔ اسکی باہیں مضبوط اور توانا تھیں!۔ اس کا قد چھوٹا تھا! لیکن اس کا جسم کچھ بھرا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی!۔ چہرے کی ہڈیاں، مضبوط تھیں!۔ ماتھا فراخ، سینہ چوڑا چکلا!۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

وہ آتے دور کا مزدور تھا!۔ جسکے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور ہوگی!۔ وہ نئی زندگی کی تعمیر کرے گا!۔ اور انسانیت کی داغ بیل ڈالے گا ــــ

اندھیرا زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ اس کے پست حوصلوں میں ایک توانائی آگئی تھی، اس کی مری ہوئی آنکھوں میں ایک نامعلوم چمک پیدا ہو گئی تھی، بے بسی کی جگہ امید نے لے لی تھی!۔ وہ زندہ رہے گا!۔۔ اور ضرور زندہ رہے گا،۔ اور اس نئے دور کی تکمیل میں اپنی جان تک لڑا دیگا۔

ندامت

صفحات :- ۱٦

اختر نے شبر سے کہا۔ "تم بھی مسلمان ہو، اور میں بھی مسلمان ہوں، تم پاکستان کے حامی ہو، اور میں بھی ـــــــ فرق صرف یہ ہے، کہ تم اس کشت و خون کے بھی حامی ہو، لیکن میں اس کشت و خون کے خلاف ہوں، تم جب یہ خبر کبھی اخبار میں پڑھتے ہو، کہ آج مغربی پنجاب میں پانچ ہندو اور دس سکھ مارے گئے، تو تمھاری آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھتی ہیں۔ تم شاید یہ سمجھتے ہو کہ تم ہندوؤں کو اس طرح قتل کر کے ختم کر سکو گے، لیکن یہ خیال عام ہے، خیر۔ مجھے اس بحث سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تمھیں ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں، اپنی قلبی واردات اُسے سُن کر بتانا۔"

شبر نے یہ فقرے سُنے اور ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گیا، اور پھر مُسکراتے ہوئے کہنے لگا "میں نصیحتیں سُننے کا عادی نہیں، ہاں تمھارا

افسانہ ضرور سنوں گا لیکن ایک شرط پر"
"کون سی شرط؟"
"بھائی کسی مسلمان کو گالی نہ دینا، نہیں تو، میری اور تمھاری لڑائی ہو جائے گی"۔ شبر نے چمک کر کہا۔
اختر نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا۔ سگریٹ کیس میں سگریٹ نہ تھے، بلکہ بیڑیاں تھیں، اختر نے ایک بیڑی سلگائی اور سگریٹ کیس شبر کی طرف سرکایا۔
"جی نہیں، میں بیڑی نہیں پیا کرتا"۔
"میں ضرورت کے وقت بیڑی بھی پی لیا کرتا ہوں، یہ تم جانتے ہو کہ میں ایک عرصے سے بے کار ہوں۔ فساد کی وجہ سے فلموں کے کاروبار کو بہت دھکا لگا ہے۔ بنیوں نے روپے دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اور لوگ کچھ ڈرے ڈرے سہمے سہمے رہتے ہیں۔ سینما جاتے ہیں لیکن دل میں خوف ہے، خطرہ ہے، مبادا کوئی اللہ کا پیارا چھری نہ گھونپ دے۔ گو اب تو کافی امن قائم ہو گیا ہے، لیکن دلوں کی میل نہیں گئی اور میں تو دن رات پروڈیوسروں کے گھروں کے گرد چکر لگاتا ہوں۔ لیکن مسلمان ہونے کی وجہ سے کہیں کام نہیں ملتا"۔
"ہندوؤں کی اور طرفداری کرو۔ خوب جی بھر کر اُن کے گُن گاؤ۔ شاید تمھیں کوئی نوکری مل جائے"۔ شبر نے طنزیہ انداز میں کہا۔
"بات چھوڑو ہندوؤں کی یہی حال مسلمان پروڈیوسروں کا ہے۔

وہ بھی ہندو کو اپنی کمپنی میں جگہ نہیں دیتے تم کیا کہتے ہو؟"
شبیر نے جل کر کہا "اختر، ہندوؤں کو بلا مغالطہ نہ کرو نہیں تو لڑائی
ہو جائے گی، تم چپکے سے اپنا افسانہ سنائیے"
اختر نے بیڑی کا ایک کش لگایا۔ دھوئیں کو کمرے میں بکھیرتے ہوئے
کہا۔ "تم آشا کو جانتے ہو؟"
"خدا بچائے ایسی لڑکیوں سے"
"خدا کی قسم تم نرے ہو۔ تم نے آشا کو نہیں دیکھا۔ ورنہ اس قسم کا
جواب تم ہرگز نہیں دیتے۔ اگر ایک بار تم اسے دیکھ لیتے تو زندگی بھر مارے
مارے پھرتے"
"یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ اختر میاں"
"کسی خوبصورت عورت سے عشق کرنا گناہ نہیں۔ اور میری محبت
تم جانتے ہو کچھ نوٹانک ٹائپ نہیں۔ یعنی عورت کے لئے مر رہے ہیں۔ سڑ رہے
ہیں۔ آہیں بھر رہے ہیں۔ قے کر رہے ہیں۔ دن کو آرام نہیں۔ رات کو نیند
نہیں۔ گلی میں انتظار کر رہے ہیں۔ اور جب لڑکی ملتی ہے تو اس سے اپنے
دل کا حال بیان نہیں کر سکتے۔ اس قسم کے عشق کا میں قائل نہیں"
"ارے رہنے بھی دے سالے۔ بائرن کی اولاد۔ آگے بتا ہوا کیا؟"
"بھئی گالی نہ دو۔ میں گالیوں کے سخت خلاف ہوں — تو ہاں
مجھے آشا سے عشق ہو گیا اس کی عمر پندرہ سال کی ہو گی۔ آنکھیں، موٹی
موٹی، خوبصورت حسین سی"

"کوئی اچھی سی تشبیہ دو نا یار۔ یہ کیا۔ آنکھیں موٹی موٹی، اچھی اچھی کیا بکواس کر رہے ہو۔"

"بیچ میں مت ٹوکو۔ جو کچھ کہہ رہا ہوں سنتے جاؤ۔ آشا جب کبھی سٹوڈیو میں آتی۔ اپنے باپ کے ساتھ آتی۔ اُس کا باپ عجیب قسم کا آدمی تھا۔ یعنی باپ ہوتے ہوئے وہ اپنی لڑکی سے پیشہ کراتا تھا۔"

"یعنی آپ ایک رنڈی سے عشق فرما رہے تھے!" شبر نے چوٹ کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں، اگر آپکو اس میں کوئی اعتراض نہ ہو تو۔"

"جی نہیں، اس میں اعتراض تو نہیں لیکن اس میں فخر کی بھی کوئی بات نہیں۔" شبر نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"میں نے یہ بات فخریہ انداز میں کبھی نہیں کی۔ اگر اُس کا باپ آشا سے پیشہ کراتا تھا تو اس میں آشا کا کیا قصور۔"

"آشا کو یہ پیشہ ناپسند تھا، تو اُسے فوراً اپنے باپ کو چھوڑ دینا چاہیئے تھا۔"

"تم میری بات تو سُن لو۔ فاسٹ ٹرین کی طرح بھاگے جا رہے ہو ٹھیرنے کا دم ہی نہیں لیتے۔ میں پہلے ہی آپ کی خدمت میں عرض کر چکا ہوں کہ آشا کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ اُس صورت میں وہ کسی غیر شخص کے ساتھ اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف نہ جا سکتی تھی، یعنی اگر میں اُسے اپنے پاس بھی رکھتا، تو اُس کا باپ قانونی کارروائی کر کے مجھے جیل میں

بھجوادیتا۔ اور لڑکی سے پھر پیشہ کراتا۔ تم ہی بتاؤ، ان حالات میں اور کیا کر سکتا تھا۔"

"اپنے دل کو سمجھاتے اور آشا سے عشق فرمانا بند کر دیتے۔"

"میں نے پہلے آپ سے عرض کی کہ میرا عشق گھچپنو ٹائپ کا نہیں میں نے آشا سے محبت کی، اور اُسے اپنایا۔ اور خاص کر یہ تو بمبئی کا عشق تھا۔ آشا پہلے ایکسٹرا لڑکی بن کے آئی۔ ہماری کمپنی کے مالک کی نظر اس پر تھی۔ آشا کے باپ کو اس کا علم ہو گیا۔ اس نے نازک وقت سے فائدہ اٹھایا۔ اُس نے آشا کو مالک کمپنی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا، اور پھر آشا . . .
. . . کمپنی کی ہیروئن تھی۔"

"اور آپ اُس کمپنی کے ہیرو تھے۔"

"جی ہاں، آشا اور کمپنی کے مالک کے درمیان روپوں کا رشتہ تھا۔ اور میرے اور آشا کے درمیان صرف محبت کا، جوانی کا — میں مسلمان تھا، اور وہ ہندو، لیکن اس کے باوجود وہ مجھے چاہتی تھی۔ اس نے اس بات کی تفریق نہ کی، کہ میں مسلمان ہوں، اُسے پاکستان سے نفرت تھی، اور مجھے ہندوستان سے۔ لیکن اس کے باوجود ہم ایک دوسرے کے قریب تھے، ایک دوسرے کو چاہتے تھے، ایک دوسرے سے ملتے تھے۔"

"ٹھہریئے اختر صاحب، ایک بات بتائیے۔"

"فرمائیے۔"

"آپ اُشا سے عشق کرتے تھے۔"

"جی ہاں۔"

"اور آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ اُشا کمپنی کے مالک کے پاس سوتی ہے"

"جی ہاں۔"

"اور اس رشتہ کے باوجود آپ اُشا سے عشق کر رہے تھے۔"

"جی ہاں۔"

"لاحول ولا قوۃ! آپ ایسے مسلمانوں کو زندہ درگور کر دینا چاہیئے۔"

"میں نے آپ سے عرض کی کہ یہ خالص بمبئی کا عشق ہے، اور بمبئی بہت بڑا شہر ہے، لاہور۔ امرتسر۔ لکھنؤ، لدھیانہ اور کراچی سے بالکل مختلف اتنا بڑا شہر ہے کہ اس میں ہندو، سکھ۔ عیسائی، مسلمان۔ پارسی سبھی سما سکتے ہیں۔ یہاں جب انسان عشق کرتا ہے، تو رُسوائی سے نہیں ڈرتا۔ کیوں، یہاں کے رہنے والے آپ کی پرائیویٹ زندگی میں دخل نہیں دیتے۔ یہاں کا عشق ٹراموں، بسوں اور ہوٹلوں میں ہوتا ہے یہ لارنس گارڈن اور شفاف جھرنوں کا عشق نہیں۔ یہ عشق کھیتوں اور جنگلوں میں نہیں ہوتا خالص مادی ہے۔ تاج اور کافی ہاؤس کا عشق ہے، گرین اور ہوٹل ڈلمار کا عشق ہے۔ عورت ملتی ہے۔ آپ اُس سے بے دھڑک باتیں کرتے ہیں۔ شرماتے نہیں۔ اور فضول بحث کرنے سے کچھ نہیں ہوتا عورت آپ کو اچھی طرح سمجھتی ہے اور آپ عورت کو۔ وہ آپکو پسند کرتی ہے، اور آپ اُسے۔ اور رات کے دلپذیر سائے بڑھنے لگتے ہیں۔ تو یہ

دونوں انسان ایک دوسرے کے ساتھ سوجاتے ہیں۔ محبت ان باتوں کے درمیان بڑھتی ہے، پلتی ہے اور جوان ہوجاتی ہے اور بوڑھی ہوجاتی ہے میری اور اُشا کی اسی قسم کی محبت تھی۔ نہیں اُسے جوٗ ہوپر لے گیا۔ ہم دونوں ریت پر لیٹے رہے اور ساتھ سمندر وحشی راگ گاتا رہا۔ اور میں اُشا سے عشق کرتا رہا۔ میں اُسے تاج میں لے گیا۔ گرین میں لے گیا۔ وہاں وسکی پی اور جی بھر کر پی۔ ہم دونوں لڑکھڑاتے ہوئے باہوں میں باہیں ڈال کر انڈیا گیٹ چلے گئے۔ ہوا تیز تھی۔ شراب تیز تھی۔ سانس تیز تھی۔ زندگی برقی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ اور انڈیا گیٹ کے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ سمندر کی تیز و تند ہوا۔ اُس کے بالوں سے کھیلتی رہی۔ اور میں اُسکے ہونٹوں کو چومتا رہا۔"

"اس دوران میں وہ کبھی حاملہ نہ ہوئی۔"

"اس لئے کہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"لاحول ولاقوۃ! بے شرمی کی حد ہے۔ خیر آگے بکو۔"

"اس دوران میں اس کا باپ اُسے جھڑکتا تھا کہ وہ مجھ سے رشتہ ناطہ توڑ دے، لیکن اُشا نے کبھی اس بات کو نہ مانا، اُس نے صاف اپنے باپ سے کہدیا کہ اگر وہ اسے اس بات کے لئے مجبور کرے گا تو وہ گھر سے بھاگ جائے گی۔ اور کسی اور کے پاس جاکر رہے گی۔ یا وہ الگ اپنا گھر بسالے گی۔ اُشا کا باپ جانتا تھا کہ اُس کے گھر کا خرچ اشا کے بغیر نہیں چل سکتا اسلئے وہ یہ جواب سُنکر خاموش ہوجاتا۔"

"عجیب قسم کا باپ تھا۔" شبر نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا۔

"زندگی کس کو پیاری نہیں ہوتی۔"

"لیکن ذلت کی زندگی بسر کرنے سے مرنا اچھا ہے۔"

"موت سے محبت کرنا آسان بات نہیں، شبر —— خیر یہ جملہ معترضہ ہے، ایک دن اُشا نے مجھ سے کہا کہ وہ شادی کرنا چاہتی ہے میں نے اُسے بہت سمجھایا کہ میری اور تمھاری شادی اسوقت نہیں ہو سکے گی، تمھارا باپ اسوقت شادی کے لیئے رضامند نہیں ہوگا۔ اور پھر فلمی حلقوں میں طوفان برپا ہو جائے گا۔ میں مسلمان ہوں اور تم ہندو اور آج کل ہندو مسلمانوں کا جھگڑا بہت بڑھا ہوا ہے۔ کچھ دن انتظار کرو۔ ذرا حالات ٹھیک ہو جائیں۔ پھر ہم شادی کریں گے لیکن وہ شادی کے لیئے بضد تھی، اور آخر کار میں نے اُسے سمجھا دیا کہ تم نابالغ ہو، تم اپنے باپ کی مرضی کے خلاف کہیں اور شادی نہیں کر سکتیں۔ دو تین سال تمھیں انتظار کرنا ہی ہوگا۔"

"یعنی آپ صرف عیش کرنا چاہتے تھے۔ شادی نہیں۔"

"جی نہیں میں جیل جانا پسند نہیں کرتا۔ اگر میں اس وقت شادی کر لیتا تو اغوا کے سلسلے میں فوراً جیل میں ٹھونس دیا جاتا۔ میں پہلے آپ سے کہہ چکا ہوں کہ میرا عشق گھنٹو ٹائپ نہیں، یعنی خواہ مخواہ جیل میں چلے جانا، کہاں کی شرافت ہے، کہاں کا عشق ہے، اور خاص کر جب فضا اس قدر مکدر ہو۔ اور حالات درست ہونے میں نہ آتے تھے۔ ہندو اور مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہو چکے تھے، مسلمان پاکستان کا نعرہ

لگا رہے تھے۔ اور ہندو اکھنڈ ہندوستان کا۔ اور دونوں نعروں کے درمیان غریب لوگ مارے جا رہے تھے۔ مسلمان محلوں میں اگر کوئی ہندو چلا جاتا، تو وہ مارا جاتا، اور اگر ہندو محلوں میں کوئی مسلمان چلا جاتا، تو اُسے جان سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ نل بازار میں سب سے پہلے جھگڑا شروع ہوا۔ مسلمانوں نے پاکستان کو حاصل کرنیکا سہل طریقہ یہی سمجھا کہ ہندو عورتوں اور بچوں کو مارو۔ ہندوؤں کو ڈراؤ اور دھمکاؤ۔ جب بنیا ڈریگا، تو سب کچھ دیگا۔ لیکن ہندو اور مسلمان انگریز کی پالیسی کو نہ سمجھ سکا۔ دونوں آپس میں لڑتے رہے اور مرتے رہے۔ میں نے اُشا سے کہا۔ "تم بھنڈی بازار چھوڑ کر ہندو محلے میں آجاؤ۔ لیکن اس نے میری بات نہ مانی، کہنے لگی، جہاں میں رہتی ہوں وہاں کسی کا ڈر نہیں۔ ہر مسلمان میرا بھائی بنا ہوا ہے۔ وہ میرے لئے جان تک دینے کے لئے تیار ہیں۔

بمبئی میں اکثر فساد ہوتا رہتا ہے۔ اِکے دُکے حملے اکثر ہوتے رہتے ہیں یہاں لوگ جم کر لڑائی نہیں لڑتے، پیٹ میں چھرا گھونپا اور چلتے بنے، یہاں کا عشق نرالا اور یہاں کی لڑائی نرالی۔ اگر شہر کے ایک کونے میں ہندو اور مسلمان ایکدوسرے کے جانی دشمن ہیں، تو دوسرے کونے میں ہندو اور مسلمان اکٹھے وسکی پی رہے ہیں۔ اکٹھے رنڈی کے کوٹھے پر جاتے ہیں، شراب پیتے ہیں اور رنڈی کے ناچ دیکھتے ہیں۔ شراب، ریس اور رنڈی کے گھر پر کبھی ہندو اور مسلمان کی لڑائی نہیں ہوتی۔ وہاں ہر شخص خدا اور مذہب کو بھول جاتا ہے۔ وہاں نہ جناح کی عزت ہے، نہ گاندھی کی۔ وہاں نہ اللہ اکبر کا نعرہ ہے نہ ہر ہر مہادیو کا وہاں نہ جناح کیپ پر لڑائی ہوتی ہے، نہ دھوتی پر جھگڑا ہوتا ہے۔ وہاں

دونوں مل بیٹھ کر ہنستے ہیں، کھیلتے ہیں، شراب پیتے ہیں، گھوڑوں پر لاکھوں روپے ہار جاتے ہیں عشق اور شراب کے جوش میں آکر زندگیوں کا جوا لگا دیتے ہیں۔ وہاں جائیوں کو خوش کرتے ہیں، گھوڑوں کو خوش کرتے ہیں، اور اپنے آپکو خوش کرتے ہیں، اور جب صبح ہوتی ہے تو یہی لوگ اپنی اپنی بلوں سے نکلکر اللہ اکبر، دین ایمان۔ قوم، ہر ہر مہادیو، گاندھی، ہندوازم، دھوتی، رام نام، عزت، وقار، دیوتا، ایشور، اسلام۔ رگ، وید، سام وید، اتھروید اور قرآن و حدیث کو سامنے رکھ کر ایکدوسرے سے لڑتے ہیں، ایکدوسرے کو جان سے مارتے ہیں، عورتوں کی بے عزتی کرتے ہیں۔ یہ عجیب قسم کے لوگ ہیں اور وہ شام میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب مجھے یہ خبر ملی کہ اُشا کو مسلمانوں نے بھنڈی بازار میں قتل کر دیا۔ وہ اپنے باپ کیساتھ گھوڑا گاڑی پر سوار تھی۔ شہر میں جھگڑا چالو تھا۔"

گھوڑا گاڑی بھنڈی بازار سے گذر رہی تھی۔ جب کسی نے پیچھے سے آواز دی۔ "اے گاڑی والے"۔

گاڑی بان نے گاڑی روک لی۔

چار مسلمان گاڑی کی طرف لپکے۔

"تم کون ہو؟"

اُشا کا باپ ہکا بکا رہ گیا۔ وہ دھوتی پہنے ہوئے تھا۔ جواب دیتا بھی تو کیا دیتا۔

"مارو سالے کو صاف ہندو دکھائی دیتا ہے"۔

"جانے نہ پائے بٹیا"

"دھوتی اُتار ڈالو اسکی"

ایک مسلمان نے گدی سے اُشا کے باپ کو پکڑا۔ اور دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔ دوسرے مسلمان نے اُشا کے باپ کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔ پھر اسکے بازو کاٹ ڈالے۔ اُسکا سر کاٹا اور اُسکو ننگا کر کے، اُسکی لاش رُوند ڈالی۔۔۔ باقی دو مسلمان اُشا کے گہنے اُتار رہے تھے۔ اشا چلا رہی تھی۔۔، چیخیں مار رہی تھی، لیکن، اُسکی چیخ کسی مسلمان تک نہ پہنچ سکی، مسلمانوں کا جھنڈا بلند تھا۔ پاکستان مل چکا تھا۔ فضا میں سبز رنگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا لیکن بھنڈی بازار کا کوئی مسلمان آگے بڑھ کر لڑکی کو چھڑانے کیلئے تیار نہ تھا۔ کوئی مسلمان آگے بڑھ کر یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ حرکت اسلام کے خلاف ہے، پاکستان کے اصولوں کے خلاف ہے۔ جناح کی تصویر ہر دکان پر لٹکی ہوئی تھی۔ لیکن یہ تصویر اسوقت خاموش تھی، چُپ چاپ تھی، ایک لڑکی کو مارا جارہا تھا۔۔، زخمی کیا جارہا تھا۔۔ اسکے گہنے اتارے گئے لیکن بھنڈی بازار کے رہنے والے سب کچھ دیکھتے رہے۔ یہ کس قسم کا اخلاق ہے، یہ کس ملک کا قانون ہے۔۔، یہ کہاں کا انصاف ہے، یہ کس قوم کا مذہب ہے، یہ کس جگہ کی انسانیت ہے۔ اور پھر چاروں مسلمانوں نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ اور چاروں چھُرے غریب لڑکی کی چھاتیوں میں پیوست ہو گئے۔ شام ہو گئی اور اُشا کی روح شام کی اُداسیوں میں غرق ہو گئی۔

میں نے اُشا کی لاش کو جے جے ہسپتال میں دیکھا۔ اُس کے جسم پر

بے شمار زخموں کے نشان تھے۔ باہوں پر، چھاتیوں پر، ٹانگوں پر، لیکن اُس کے چہرے پر ایک بھی زخم نہ تھا۔ وہ آنکھیں آج خاموش تھیں، بند تھیں۔ اُس کا سینہ خاموش تھا۔ اور بال میلے اور گندے ہو چکے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے بہت غصہ آیا اور دل میں یہی خیال آیا کہ ابھی وقت بھنڈی بازار میں جاکر تین چار مسلمانوں کو جان سے مار ڈالوں اور کہوں کہ مردودو تم سب اسلام کے نام پر کلنک ہو۔ تم نے انصاف اور مساوات کا جھنڈا بلند نہیں کیا، بلکہ گناہ اور ظلم کا جھنڈا بلند کیا ہے۔ اگر میرا بس چلے تو مسلمانوں سے پاکستان چھین لوں۔ اور ہندوؤں سے ہندوستان۔ یہ آزادی نہیں ہے بربادی ہے۔

مشبر، سچ بتاؤ۔ اس واقعہ کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟ تم جو کٹر مسلمان بنتے ہو، تم جو ہندوؤں کی چوٹی دیکھ کر آگ بگولا ہو جاتے ہو، تم جو ہندوؤں کی دھوتی دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہو۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو اس واقعہ کے متعلق۔ تم جو ترنگا جھنڈا دیکھ کر گالیاں دیتے ہو۔ پاک بازی اور راست گوئی کو سراہتے ہو۔ کمینگی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہو۔ اور اسلام کی شرافت کا بوجھ کندھوں پر اُٹھائے ہوئے اِدھر اُدھر پھرتے ہو۔ تمھاری اس خون کے متعلق کیا رائے ہے کیا اسی خون پر پاکستان کی تعمیر کرنا چاہتے ہو۔ کیا ہماری آنے والی نسلیں اس کُشت وخون کی داد دیں گی؟"

یہ سنتے ہی شبر نے کہا "اختر ـــــ ذرا بیڑی دینا"۔
آواز میں لرزش تھی۔
اختر نے سگریٹ کیس سے بیڑی نکالی اور ماچس جلا کر دھوئیں کو کمرے میں چھوڑ دیا۔
اختر نے شبر کی طرف دیکھا۔ شبر ندامت کے آثار کو بے سود چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

ان سے بچکر

صفحات :- ۱۴

"مہندر صاحب، تو بس بات پکی ہوگئی۔"

"کون سی بات صاحب؟"

"ارے صاحب، یہی فلم کی بات، یعنی آپ کی فلم بک گئی اگر نہیں بکی تو بیچ دی جائے گی۔ باقی رہا روپیوں کا معاملہ۔ اُس کی بات جانے دیجئے وہ تو گھر کا معاملہ ہے، میری اور آپ کی جان پہچان ہوگئی ہے، اور اب ہمارا اور آپ کا رشتہ اتنا گہرا اور مضبوط ہوگیا ہے، کہ اب کسی بات کی گنجائش نہیں رہی۔ آپ جتنے روپے کہیں گے دلوا دوں گا۔ اور میں فلم دیکھ کر کیا کروں گا۔ فلم میں کتنے گانے ہیں؟"

"چھ۔"

"بہت خوب، ارے صاحب زیادہ گانے رکھ کر کہاں اچھی فلم بنتی ہے"

کہانی کی ایسی تیسی ہو جاتی ہے۔ آپ نے اچھا کیا جو صرف چھ گانے رکھے
بہر حال اب زیادہ بات چیت کی ضرورت نہیں۔ بس سمجھیے کہ آپ کی فلم
بک گئی اور روپے آپ کو مل گئے۔ میں نے اپنے ساتھی کو تار دے دیا ہے،
وہ دو ایک دنوں میں یہاں آجائیں گے۔ اور پھر ہم لوگ فلم دیکھیں گے! اور
باقی سب باتیں طے ہو جائیں گی۔ باقی باتیں بھی کیا رہ گئی ہیں۔ اب تو آپ
ہمارے ساتھی بن گئے ہیں۔ کبھی کلکتہ آئیے نا۔ ہمارے اسٹوڈیو میں۔ میں
نے بھی دو کتابیں بنائی ہیں۔"

"کون سی کتابیں؟"

"ارے یہی فلمیں۔ میں فلم کو کتاب کہتا ہوں۔ مہندر صاحب ایسی
کتابیں بنائی ہیں کہ انڈسٹری کی ...... (اتنی موٹی گالی اُنھوں نے
بک دی کہ طبیعت صاف ہو گئی) اور گانے ــــــ؟ ہندوستان میں ایسے
گانے کوئی نہیں لکھ سکتا۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایسے گانے
کبھی کسی کتاب میں نہیں آئے اور نہ آئیں گے (اور اس کے بعد اُنھوں نے
دو گیت سُنائے۔ گیت سُنانے کے دوران میں آپ کبھی صوفے پر بیٹھ جاتے
تھے۔ کبھی لیٹ جاتے تھے۔ کبھی ہاتھوں کو بڑھا چڑھا کے باتیں کرتے۔ کبھی
اُن کی آنکھیں سُرخ ہو جاتیں، مُنہ سے جھاگ نکلنے لگتی۔ اور کبھی کبھی اتنے
زور سے چلّاتے کہ توبہ ہی بھلی۔ خدا خدا کر کے گیت ختم ہوئے، تو اُنھوں نے
پھر فلموں کے متعلق لکچر شروع کر دیا۔) ارے صاحب، بمبئی کے لوگ فلمیں
کیا بنائیں گے نہ کمبختوں کو آئے زبان اور نہ ہی ان کے پاس عقل ہوتی ہے۔

آپ کی قسم مہندر صاحب اگر میں ممبئی میں جم گیا تو ساری بمبئی کو ہلا دوں گا۔ ابھی میں نے امپیریل فلم کمپنی کی فلمیں خریدی ہیں۔ "اندرا ایم اے" "بے بی نادیا"۔ "مائی ڈارلنگ"۔ "ملاپ"۔ "اُلّو کا پٹھا"۔ یہ سب فلمیں ہماری ہیں اور ہمارا خرچ بھی کچھ نہیں ہوا۔ دوستانہ ہے امپیریل والوں سے۔ انھوں نے خود ہی ساری فلمیں میرے سپرد کر دیں۔ ارے صاحب آپ کی فلم کی ایسی پبلسٹی کروں کہ سارا ایشیا دنگ رہ جائے گا۔ ایک ہی وقت میں سولہ میں ہاؤس میں یہ کتاب ریلیز کر دیں گے۔ اور ساتھ ہی وہ پبلسٹی کریں گے کہ سارے کلکتہ کو اپنی طرف کھینچ لیں گے۔ کلکتہ میں مجھے کون نہیں جانتا۔ بنگال کا بچہ بچہ میرے نام سے واقف ہے۔ گو بنگالیوں پر مجھے یقین نہیں ارے صاحب۔ یہ بنگالی باتیں بہت کرتے ہیں اور باتیں کافی دلچسپ کرتے ہیں لیکن صاحب ان سے بچکر رہیئے گا۔ سانپ کے کاٹے کی دوا ہے لیکن بنگالی کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں کمبخت جڑ ہی کاٹ دیتا ہے، نہ رہے بانس نہ بجے بانسری — لیکن مہندر صاحب ہم نے وہ دھاک بٹھائی ہے کلکتہ میں کہ سالے یاد کریں گے۔ ان کو آتا بھی کیا ہے۔ ٹیگور کے چند نغمے یاد کر لئے۔ دھوتی اور قمیض پہنکر ہر بنگالی آرٹسٹ بن جاتا ہے۔ اجی صاحب ایک بار سرت بابو کلکتہ میں تشریف لائے، مجمع میں کئی لاکھ آدمی تھے۔ میں نے سرت بابو سے کہا کہ میں بھی بولوں گا۔ اُنھوں نے کہا۔ بنگال کے بڑے بڑے لیڈر بول رہے ہیں۔ اب کی بار آپ معاف کیجئے گا۔ مجھے غصہ آگیا یہ جواب سُنکر میں نے کہا۔ میں بول کر دم لوں گا۔ اگر آپ نے بولنے کی اجازت نہ دی تو

اسی وقت بھوک ہڑتال کر دوں گا، اور یہ جواب سن کر سرت بابو کو میری بات ماننی پڑی۔ اور میں نے تقریر کی اور وہ تقریر کی کہ سارا مجمع سکتہ میں آ گیا۔ لوگ خاموش ہو گئے۔ ایک سناٹا چھا گیا اور آخیر میں میں اتنے زور سے چلایا کہ مائیک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ حاضرین نے تالیاں بجائیں۔ اور میں جلسے سے واپس چلا آیا۔ ارے صاحب میں ان سرمایہ داروں کی کیا پرواہ کرتا ہوں۔ میرا بس چلے تو سب کو جیل میں ٹھونس دوں۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ میں ہندی کا پروفیسر رہ چکا ہوں۔ ایک بار میں نے کلاس میں کہہ دیا کہ امیر کتے ہوتے ہیں اور غریب کوتے۔ کلاس میں بہت سی امیروں کی لڑکیاں تھیں۔ ایک لڑکی کو بہت غصہ آیا اور اس نے اٹھ کر کہا "آپ غلط کہتے ہیں۔ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ آپ گالی بک رہے ہیں۔" لڑکی کو دیکھ کر میں گھبرا سا گیا۔ مہندر صاحب میری شادی ہو چکی ہے۔ اور میری بیوی بہت خوبصورت ہے۔ بے چاری کو میں کلکتہ چھوڑ آیا۔ اس وقت میرا انتظار کر رہی ہوگی —— مہندر صاحب آپ نے میری بیوی کو نہیں دیکھا۔ گنگا مائی کی قسم۔ اگر آپ دیکھ لیں تو لٹو ہو جائیں۔ رہ رہ کر اس کی یاد آتی ہے۔ اگر میں اسے یہاں لے آتا تو کم سے کم بے چاری بمبئی تو دیکھ لیتی۔ اگلی بار اسے ضرور بلاؤں گا۔ اب تو بمبئی میں میرے بہت سے بن گئے ہیں۔ اور پھر آپ کا گھر تو بس اپنا گھر ہے۔ اور کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے ——

—— تو ہاں میں کہہ رہا تھا کہ لڑکی نے اعتراض کیا۔ میں نے پھر بے دھڑک کہا اگر میں ابھی اسی وقت آپ لوگوں کو یہ ثابت نہ کر دوں کہ امیر کتے ہوتے ہیں۔ اور غریب کوتے —— تو میں اسی وقت پروفیسری سے استعفا دے دوں گا اور صاحب

میں نے وہ بات بتائی کہ سب کو قائل ہونا پڑا۔ میں نے کہا مہندر صاحب ــــ
ــــ کہ دوستو ــــ یعنی طالب علمو، طالب علم بھی دوست ہوتے ہیں۔ میں
شاگردوں پر کبھی رعب نہیں جماتا۔ اس لئے میں کالج میں بہت پاپولر تھا۔ اور
خاص کر لڑکیوں میں۔ میں کبھی کسی غیر لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا اور
اب جب کوئی لڑکی اسٹوڈیو میں آتی ہے تو اس سے سب سے پہلے یہ پوچھتا
ہوں۔ کہ تمھارا کیا کام ہے یہاں پر۔ اگر کچھ کام نہیں تو فوراً اسٹوڈیو سے باہر
ہو جاؤ۔ یہاں اڈہ مارنے کی کوئی جگہ نہیں۔ اسی وجہ سے اسٹوڈیوز کے مالک
مجھ سے ڈرتے ہیں، خوف کھاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ سچ بابو جو کہتا ہے، درست
کہتا ہے۔ دراصل میرا نام سچ بابو ہے۔ میں سچ بولنے سے کبھی نہیں ڈرتا۔ میں نے
زندگی میں بہت برُے دن دیکھے ہیں۔ میں نے فاقے کئے ہیں۔ میں جیل میں
گیا ہوں۔ میں نے کانگریس میں پرچار کیا ہے۔ اشتراکیوں کی محفل میں بیٹھا ہوں
اور ہندو مہا سبھا کا رکن ہوں۔ ارے صاحب، بمبئی میں تو مسلمانوں کا راج ہے۔
غضب ہے مہندر صاحب، پیسہ ہندوؤں کا۔ اسٹوڈیو ہندوؤں کے۔ اور
فلمیں بنانے والے مسلمان۔ کمال ہو گیا۔ غضب ہو گیا۔ جس اسٹوڈیو میں
جاؤ۔ وہاں کا ڈائرکٹر مسلمان۔ ارے صاحب کوئی ہندو ڈائرکٹر ملتا ہی نہیں اور
مسلمان ڈائرکٹروں نے تو کمال کر دیا۔ ہندوستان میں رہکر پاکستان کا پروپگنڈا
کرتے ہیں۔ حال میں ایک مسلمان ڈائرکٹر نے ایک فلم بنائی ہے۔ بابو صاحب
حد ہو گئی۔ ایک مسلمان چھوکرا ایک ہندو لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ ارے صاحب
یہ سب مسلمان ڈائرکٹر کی بدمعاشی ہے۔ اب تو پاکستان بن چکا ہے۔ یہ لوگ

پاکستان میں کیوں نہیں جاتے۔ مہندر صاحب اگر آپ اجازت دیں تو میں اس فلم کو بند کرا دوں۔ صرف دو گھنٹے کی مہلت چاہیئے۔ دس چھوکروں کو سینما کے باہر جا کر بھوک ہڑتال کرا دوں۔ کھیر صاحب سے جا کر کہوں۔ ۱۹۴۷ء میں اس قسم کا انیاچار ہو رہا ہے۔ مسلمان لونڈے ہندو لونڈیوں سے عشق کرتے ہیں۔ اور مسلمان ایکٹر یہاں آ کر اپنا نام بدل لیتے ہیں۔ میرا بس چلے تو ایسا قانون بنواؤں کہ جو مسلمان ایکٹر ہندو کا نام رکھے۔ اُسے فوراً ہندو بنا لیا جائے۔ یہ کیا بکواس ہے۔ ارے صاحب، کلکتہ میں، میں نے سب پروڈیوسروں سے کہدیا تھا کہ اگر فلم بنانی ہے تو سب ایکٹر ہندو رکھو اور اگر کسی مسلمان کو جگہ دینا ہے تو صرف مسلمان چھوکری کو۔ اور اُسے اپنے قبضہ میں رکھو۔ اور اگر تم لوگ یہ باتیں نہیں کرو گے تو اسٹوڈیو کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ تمھارے گھروں میں آگ لگا دوں گا۔ فلمیں جلا دونگا ہڑتال کرا دوں گا ——— یہ سنتے ہی مارواڑی سیٹھ بھیگی بلی کی طرح خاموش ہو گئے۔ اور تمام مسلمانوں کو اسٹوڈیو سے باہر کر دیا۔ ارے صاحب، آپ کیا سمجھتے ہیں مجھے۔ ایک بار کلکتے میں جواہر لعل آئے۔ پندرہ اگست کے بعد۔ جلتے ہو کانگریس والوں نے کیا بدمعاشی کی۔ بھائی مہندر، ملوں میں چھٹی کرا دی تاکہ لوگ لاکھوں کی تعداد میں جمع ہوں، ملوں کے علاوہ اسکولوں اور کالجوں کو بند کروا دیا تاکہ سبھی لوگ جواہر لعل کی تقریر سُننے کو جائیں۔ مل کے مزدوروں کو یہاں تک دھمکایا گیا کہ اگر تم لوگ جلسے میں شریک نہ ہوئے، تو تمھاری ایک دن کی تنخواہ کاٹ لی جائے گی۔ اُس دن

کوئی بیس لاکھ کا مجمع تھا — مہندر صاحب، میں نے جواہر لعل کے چھکے چھڑا دیئے۔ بڑا انٹر نیشنلسٹ بنا پھرتا ہے اگر وہ انٹر نیشنلسٹ ہے تو میں نیشنلسٹ ہوں۔ کیا میں کسی سے کم ہوں میں نے جواہر لعل سے وہ سوال و جواب کئے کہ یہ بے چارے خاموش ہو گئے۔ وہ بے چارے جواب بھی کیا دیتے۔ موتی لعل کی وجہ سے اتنے بڑے ہو گئے ہیں۔ نہیں تو کون پوچھتا ہے انھیں اور ہم نے جو آج تک ترقی کی ہے، وہ صرف اپنے بل بوتے پر، مہندر صاحب، زندگی میں ترقی کرنا ہے تو اپنی تعریف آپ کیجئے۔ اپنا ڈھول آپ پیٹیئے۔ جہاں جاؤ اپنی تعریف آپ کرو۔ اپنے گن گاؤ۔ اپنے ہی بغل بجاؤ۔ کسی کی بات نہ سنو۔ کسی کو بات نہ کرنے دو۔ عرصہ دس سال سے میں اسی راستہ پر چل رہا ہوں۔ تب جا کر یہ پدوی نصیب ہوئی ہے — میں سرمایہ داروں کو بالکل تباہ کرنا چاہتا ہوں۔ جب صبح اُٹھتا ہوں تو پرارتھنا کرتا ہوں کہ اے پربھو۔ ان سب سرمایہ داروں کو تپ دق کر دے۔ ایک بار ایک سرمایہ دار میرے ہتھے چڑھ گیا۔ میں نے اُس کی ناک کاٹ ڈالی، اور اُس کا سارا خون پی گیا — ، اور جب مخالفت پر آجاتا ہوں تو اپنے باپ سے نہیں ڈرتا۔ اگر میری مخالفت میرا باپ کرے گا تو میں اُسے جان سے مار ڈالوں گا۔ تو ہاں میں ذکر کر رہا تھا۔ اُس کلاس روم کا جب میں نے یہ کہا کہ سرمایہ دار کتے ہوتے ہیں اور غریب کوّے تو میرے شاگرد چونک اُٹھے، لیکن مہندر صاحب میں نے اس وقت بات ایسی کہی، کہ سبھی لوگ دنگ رہ گئے۔ میں نے انھیں بتایا کہ اگر آپ کو میری بات کا

یقین نہیں آتا۔ تو آج ہی رات چھت پر چاول پھینک کر دیکھو۔ صبح ہوتے ہی
کوّے اکٹھے ہونگے اور کائیں کائیں کرتے ہوئے باقی کوّوں کو بلائیں گے۔ اور
مل بیٹھ کے چاول کھائیں گے۔ اسی طرح جب کبھی آپ کسی غریب کے
جائیں گے تو وہ آپ کی آؤ بھگت کرے گا، آپ کو کھلائے گا پلائے گا۔ اس
کے برعکس، اگر آپ کسی کتّے کے آگے گوشت کی ایک پلیٹ رکھ دیں گے
اور پھر ایک اور کتّے کو اُس کے قریب آنے دیجئے۔ اور پھر دیکھئے تماشہ
پہلا کتّا غرّائے گا۔ لڑے گا اور دوسرے کتّے کو مار بھگائے گا۔ اسی طرح کسی
امیر آدمی کے گھر کے قریب کوئی غریب انسان رہتا ہو۔ تو امیر کبھی اُسے نزدیک
نہ آنے دے گا۔ اُس کے گھر کبھی نہ جائے گا۔ اور ہر وقت یہی چاہے گا کہ
غریب یہاں سے چلا جائے۔ توان باتوں سے صاف ظاہر ہوا کہ امیر کتّے
ہوتے ہیں۔ اور غریب کوّے ـــــ اجی، یہ بات جونہی میں نے کہی کہ سارے
طلبا میرے پاؤں پڑ گئے اور وہ لڑکی دوڑتی ہوئی میرے قریب آئی، تھی
وہ امیر خاندان کی لڑکی، اکثر وہ لپ اسٹک لگاتی تھی۔ اور بڑی بن ٹھن کر
آتی تھی ـــــ صاحب، میری تقریر کا وہ اثر ہوا اس پر کہ اُس نے لپ اسٹک
لگانی چھوڑ دی اور ایک کھدر کی دھوتی پہن کر وہ کالج میں آنے لگی۔ تو حضنا
یہ ہے، میرا کرشمہ ـــــ جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے۔ مہندر صاحب!
آپ ہماری کتاب میں کام کیجئے۔ بھوانی کی قسم، اگر آپ کو نمبر ایک کا اسٹار
نہ بنا دوں تو سچ بابو میرا نام نہیں۔ میں ہمیشہ سچ بولتا ہوں گپیں کبھی نہیں
ہانکتا۔ حال ہی میں، میں نے ایک کتاب بنائی تھی، جس میں سبھاش بوس کا
کام رکھا گیا تھا۔ جب لوگوں نے یہ فلم دیکھی تو عش عش کرنے لگے، میرے گلے

سے لپٹ گئے۔ وہ تعریف کی کہ شانتا رام بغلیں جھانکنے لگے۔
اور آپ کا کام تو صرف دس پندرہ روز کا ہوگا۔ پیسوں کے متعلق کچھ نہ پوچھیے۔ آپ کی فلم ہے۔ مجھے فلم سے روپے کمانے نہیں۔ صاحب، صرف آدرش کی خاطر فلم بنا رہا ہوں۔ میں تو مزدور پروڈیوسر ہوں۔ سرمایہ داری کو لعنت سمجھتا ہوں۔ صرف تیس ہزار میں فلم مکمل کر دوں گا۔ اور اس طرح انڈسٹری میں ایک نیا ریکارڈ قائم کروں گا۔ صرف اٹھارہ ہزار فلم Expose کروں گا۔ ارے صاحب، یہ بڑے بڑے نامی ڈائرکٹر Raw stock کو محض آگ لگاتے ہیں۔ شاٹ لینے آتے نہیں۔ فلم برباد کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک ایک شاٹ کو دس بار لیں گے، اجی صاحب، وہ ڈائرکٹر ہی کیا، جو ایک شاٹ کو دس بار لے۔ میں ایک شاٹ کو صرف ایک بار لوں گا۔

ابھی ابھی میں نے ایک فلم بنائی ہے، لگنے دیجئے، اُسے کسی ہاؤس میں، اگر دس سال تک اُتر جائے تو میرا نام سچ بابو نہیں۔ مہندر صاحب، اس فلم میں ہندوستان کے مہاکوی نے ایک گیت لکھ کر دیا تھا۔ گیت واقعی بہت اچھا تھا۔ ہندوستان میں کوئی اور شاعر ایسا گیت نہیں لکھ سکتا۔ لیکن چالاکی دیکھیے اس مہاکوی کی۔ یعنی وہ یہ چاہتا تھا کہ اُس کا گیت پوری فلم کو مات کر دے۔ میں مہاکوی کی چال سمجھ گیا۔ میں نے سوچا۔ بیٹا۔ اگر اس گیت کا

ستیاناس کر دیا، تو میرا نام سچ بابو نہیں ۔ اور صاحب جب گیت کی ٹیکنگ ہونے لگی، تو میں نے گیت کو made over کر دیا یعنی اُس گیت میں اتنے شاٹ ڈالے ۔ اتنے شاٹ ڈالے کہ دیکھنے کے بعد لوگوں نے مجھے شاباشں دی، لوگوں نے گیت کو سُنا ہی نہیں ۔ گیت غائب تھا ۔ آواز ندارد تھی ۔ موسیقی غائب تھی ۔ صرف شاٹ ہی شاٹ تھے ۔ لوگ فلم کو دیکھتے جاتے اور تالیاں پیٹتے جاتے تو جناب عالی، یہ ہوتی ہے ڈائرکشن ــــــــ

تو ہاں دس پندرہ روز کے لئے کلکتہ آئیے ذرا تفریح رہے گی سوناگاچی مارکیٹ کا چکر لگائیے ۔ ارے صاحب ایسی لڑکیاں دکھاؤں کہ من موہت ہو کر رہ جائیے ۔ اس بازار میں مجھے کون نہیں جانتا ۔ ایک ایک گلی سے واقف ہوں، ایک ایک موڑ کو جانتا ہوں ایک ایک صورت سے آشنا ہوں ۔ کسی کی طرف نگاہ کیجئے جھٹ سے آپ کے قدموں پر نہ آ جائے تو میرا نام سچ بابو نہیں ۔ ارے صاحب کلکتہ میں اتنا رسوخ نہ ہوتا تو لوگ ہماری عزت کیسے کرتے ــــــــ

تو ہاں ۔ میں کہہ رہا تھا کہ میں آپ کو ویلن کا پارٹ دوں گا ۔ مکالمے یہاں بھیج دوں گا ۔ وہ یاد کر لیجئے ۔ میں آپ کو تار دے کر بلالوں گا ۔ فوراً کام کر کے واپس چلے آئیے اور جب فلم بک جائے گی، آپ کو تنخواہ مل جائے گی ۔ میرا اور آپ کا تو گھر کا معاملہ ہے ۔ مجھے کون سا

سرمایہ دار بنتا ہے۔ نیتاجی کی قسم۔ جب کسی سرمایہ دار سے ملتا ہوں، تو جی میں یہی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اس سالے کے کچھ روپے خرچ کرادوں۔ ملتے ہی میں اُس سے کہتا ہوں کہ بھائی شربت پلاؤ۔ چائے پلاؤ۔ پان پوری کھلادو۔ سگرٹ پلادو۔ کمبخت کچھ تو کھلائے گا۔ کچھ تو پلائے گا۔ ایک پیسہ بھی اُس کی جیب سے کم ہو جائے، تو میں خوش ہو جاتا ہوں —— مہندر صاحب، پانی منگوایئے۔ ٹھنڈا۔ ذراسی برف منگوا لیجئے

مہندر صاحب میں ریڈیو پر کام کر چکا ہوں۔ ایک بار ریڈیو والوں نے مجھ سے کہا کہ میں پٹیل کی زندگی پر کچھ بولوں۔ ذرا آپ ہی بتایئے کہ پٹیل کی زندگی پر کیا لکھا جا سکتا ہے۔ اس نے کیا کیا ہے۔ بہر حال میں نے منظور کر لیا۔ جب بولنے کا وقت آیا تو پہلے دو چار فقروں میں مَیں نے پٹیل کی تعریف کی۔ اُس کے بعد میں نے سبھاش بوس پر تقریر جھاڑ دی اور نیتاجی کی وہ تعریف کی کہ ریڈیو والوں کو ریڈیو بند کرنا پڑا۔

اس کے بعد اُنھوں نے کبھی بھی مجھے بُک نہ کیا —— یہ سالے کیا سمجھتے ہیں۔ موقعہ آنے دیجئے۔ اگر میں ہندوستان کی اینٹ سے اینٹ نہ بجادوں تو میرا نام بیج بابو نہیں —— (پانی پی کر) اچھا صاحب۔ اب میں جاتا ہوں اجازت دیجئے گا۔ دراصل وہ کتاب کی بات تو پکی ہو گئی۔ میرے ساتھی کے آنے پر سب بات طے کر لی جائے گی۔ بات تو ویسے پکی ہی سمجھئے۔ وہ فلموں کے متعلق کیا جانتے ہیں۔ جو میں کہوں گا۔ وہی ہوگا۔ دراصل مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ میں اپنے ساتھ اپنی بیوی کو نہیں لایا۔

وہ بے چاری کلکتہ میں کیا کرتی ہوگی میرے انتظار میں اُس کی بُری حالت ہوگی۔ اگر وہ آجاتی تو بڑا لطف رہتا۔

خیر اگلی بار ہم ضرور آئیں گے اور آپ کے پاس ضرور ٹھیریں گے۔ اچھا اجازت دیجیئے ——— اس کتاب کا فکر نہ کیجیئے۔ سمجھئے کہ وہ بک گئی۔"

اور یہ الفاظ کہتے ہوئے، ہاتھوں کو ہلاتے ہوئے بچ بابو کمرے سے باہر نکل گئے۔ اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور صرف یہ سوچتا رہا کہ اگر ایسے آدمیوں کو پاگل خانے میں بھیج دیا جائے تو یہ قوم و ملک دونوں کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔

اُس کی جنّت

صفحات :- ۱۸

اس رات سلیم دوڑتا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا اور ہانپتے ہوئے کہنے لگا۔

"بھائی راج، چلو سمندر کے کنارے"

"کیوں؟" میں نے روکھے لہجہ میں کہا۔

"ارے ظالم۔ آج پورن ماشی ہے۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھ، کتنی حسین رات ہے۔ چاندا اپنے پورے جوبن پر ہے"!

"تو کیا ہوا؟"

"ہوا ہی کچھ نہیں، عجیب قسم کے انسان ہو۔۔۔ بھائی ۔۔۔ راج بھائی ۔۔۔ آج میری بات مان لو۔ اور میرے ساتھ بیچ پر چلو، اور چاندنی رات کا نظارہ کرو۔" سلیم یہ فقرے کہکر کھڑکی میں سے جھانکنے

لگا۔ اُس نے ایک منٹ میرا انتظار کیا اور پھر گردن کو جھٹکا دے کر وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ "ارے یار ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔ کپڑے پہن لو لیکن پینٹ پہن کر کیا کرو گے۔ یہ پاجاما بالکل ٹھیک جچتا ہے۔ اُٹھو۔ چلو۔ تمھیں میری قسم۔ اس چاند کی قسم۔ اس حسین رات کی قسم"۔

سلیم کے لہجہ میں بچوں ایسا پیار تھا، اُس کی آنکھیں واقعی چاند دیکھ کر چمک اُٹھتی تھیں۔ جب کبھی برسات کے موسم میں بارش موسلا دھار برسنے لگتی۔ تو وہ دوڑتا دوڑتا میرے کمرے میں آتا۔ ارے یار ابھی تک سوئے ہو۔ ادھر دیکھو، باہر دیکھو، کتنی خوبصورت بارش ہو رہی ہے، اور یہ تازہ ہوا۔ جس میں شبنم کی تازگی ہے۔ جس میں کسی حسین دوشیزہ کے باہوں کی لچک ہے۔ اور یہ کالی گھٹائیں۔ اور سیاہ بادل ـــ راج بھائی، میں پاگل ہو جاؤں گا، تیری قسم میں پاگل ہو جاؤں گا۔ ـــ اُف یہ برسات کا موسم۔ وہ مجھے جگانے کی کوشش کرتا لیکن میں چپکے سے بستر پر لیٹا رہتا۔ لیکن آج مجھے اس کے ساتھ جانا پڑا۔

بیچ قریب ہی تھا۔ تھوڑی دور پیدل چل کر سمندر آگیا۔ کوئی گیارہ بجے کا وقت ہوگا۔ بیچ بالکل سنسان اور اُجاڑ تھا۔ صرف ساحل تھا۔ ریت تھی۔ اور سمندر کی لہریں۔ اور دور ناریل کے درخت چُپ چاپ کھڑے تھے۔ تم نے اوپر نگاہ ڈالی راج۔ ظالم چاند کی طرف دیکھو چاند کی طرف دیکھتے ہی سلیم کی باچھیں کھل گئیں۔ اُس کی آنکھیں مُسکرانے لگیں۔ اُس کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔ اپنی ٹانگوں پر ہاتھ مارتے ہوئے

کہنے لگا۔" ہائے یہ چاند، اور اس کی سنہری کرنیں۔ میں مر جاؤں گا راج بھائی۔ ایسی حسین رات میرے اللہ۔"

"تم کتنے عرصے سے اس چاند کو دیکھ رہے ہو؟" میں نے سانس اندر کھینچ کر کہا۔

"ستائیس بہاریں دیکھی ہیں میں نے زندگی کی۔ اور ہر پورنماشی کی رات کو اس چاند کو دیکھا ہے۔" سلیم نے ریت پر لیٹتے ہوئے کہا۔

"اور ابھی تک اس چاند سے اکتائے نہیں۔"

"نہیں، قطعہ نہیں، بلکہ دن بدن اس چاند سے محبت ہوتی جا رہی ہے۔ میں ہر مہینے اس بیچ پر رات گذارتا ہوں۔"

"تمام رات؟" میں نے چونک کر کہا۔

"ہاں۔ ہاں۔ تمام رات۔ پورن ماشی کی تمام رات۔ اس بیچ پر بڑا پُر کیف نظارہ ہوتا ہے۔ یہ بیچ بالکل اکیلا، اور رُومان انگیز ہوتا ہے۔ میرے سوا کوئی انسان کا بچہ ادھر اس وقت نہیں آتا۔ لیکن چاندنی رات اپنا دامن پھیلائے مجھے اپنے آغوش میں لے لیتی ہے۔ اور اپنے نرم نرم ہاتھوں سے مجھے سہلاتی ہے۔ لوریاں دیتی ہے۔ دُور بہت دُور۔ ماہی گیر کشتیوں پر سوار۔ بادبان پھیلائے۔ اس وسیع سمندر میں تیرتے پھرتے ہیں۔ سمندر کا وحشی راگ ان سُنی کہانیاں سُناتا ہے۔ ریت کے ذرّے چاندی میں نہاتے ہیں، اور ناریل کے درخت چُپ چاپ خاموش میری طرف تکتے ہیں اور میری یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔

"تم کیا سوچتے ہو یہاں آکر۔"

"اپنی محبوبہ کے متعلق۔"

"کیا تم کسی سے محبت کرتے ہو؟"

"نہیں تو۔"

"تو پھر کس کے متعلق سوچتے ہو؟"

"صرف اپنی خیالی محبوبہ کے متعلق راج بھائی۔ وہ محبوبہ جو میری زندگی میں داخل ہوگی۔ نہ جانے کب۔ لیکن وہ آئے گی ضرور راج بھائی۔ وہ دیکھو۔ وہ کشتی، جو سمندر پر تیر رہی ہے، وہ بادبان، جو آنچل کی طرح لہرا رہا ہے۔ رات کتنی حسین ہے۔ یہ کشتی کتنی حسین ہے، یہ ماہی گیروں کی کشتی ہے۔ یہ مچھلیاں پکڑنے نکلے ہیں۔ آج چودھویں کا چاند ہے۔ سمندر اپنے پورے جوبن پر ہے، رات اپنے پورے جوبن پر ہے۔ راج کوئی قصہ سناؤ۔ کوئی دل چسپ بات۔ کوئی ایسی کہانی، جس میں خوبصورت عورتوں کا ذکر ہو۔ رنگین تصویریں۔ قوس وقزح۔ زلف کا پیشانی پر بکھر جانا۔ نگاہوں میں پیار۔ ہاتھوں میں ملائمت۔ نرم نرم فقرے، شہد آگیں سانس، کچھ ایلورا کا ذکر۔ کچھ اجنٹا کے نقوش۔ ایلیفنٹا کی سنگ تراشی۔ وہ بت جس میں پھول کی سی نرمی ہو۔ عورت جیسی لچک ہو۔ اور چاند ایسی ٹھنڈک ہو۔ کوئی ایسا گیت گاؤ کہ فضا میں بجلی دوڑ جائے۔ ہوا تند اور تیز ہو جائے۔ بادبان پھڑپھڑانے لگیں اور آنچل لہرا جائیں۔ یہ وقت بار بار نہیں آتا۔ یہ ہنسی اور خوشی کا وقت۔ ایک بار میں نے سوچا تھا

کہ جب میرے پاس دس ہزار روپے ہو جائیں گے تو بس یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"کہاں جاؤ گے ؟"

"اپنے گاؤں"۔

"کیا کرو گے جا کر؟"

"اپنا مکان بنواؤں گا"۔

"مکان بنوا کر کیا کرو گے۔ بمبئی میں کوئی اچھا سا فلیٹ بنوا لو اور مزے سے زندگی گزارو۔"

"میں اپنی پسند کا فلیٹ بنوانا چاہتا ہوں کہ میرا فلیٹ ایسا ہو۔ ایسا ہو۔ ایسا ہو۔ ارے راج بھائی۔ اُس چاند کی طرف دیکھو۔ اللہ کی قسم بڑے غیر رومانی انسان ہو۔ تو ہاں، میرا فلیٹ ایسا ہوگا، کہ ہوا ہولے ہولے میرے فلیٹ کو چومتی رہے۔ اور پھر میرا ڈرائنگ روم۔ اُسے کس طرح سجاؤں گا، بتاؤ راج بھائی"۔

"بتانے سے کیا فائدہ۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمھارے پاس اسوقت کتنے روپے ہیں ؟"

"صرف آٹھ آنے"۔ سلیم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تو پھر شیخ چلی کی طرح باتیں کیوں کرتے ہو"۔

شیخ چلی کی طرح باتیں نہیں کرتا، بلکہ مجھے یقین ہے کہ میں پانچ سال کے اندر اندر دس ہزار روپے جمع کر لوں گا"۔

"وہ کس طرح ؟"۔

"میں تمھیں بتاتا ہوں، لیکن ذرا ان درختوں کی طرف دیکھو کیتنی خاموشی سے کھڑے ہیں۔ اور چاند کی تیز کرنوں میں نہا رہے ہیں! اور یہ ریت کے ذرّے نیند سے مدہوش اور چُور ہیں۔ یہاں زندگی کیتنی ساکن ہے۔ چُپ چاپ۔ لہریں آتی ہیں، اور ساحل سے ٹکرا کر چلی جاتی ہیں۔ یہاں نہ سرمایہ دار ہے نہ مزدور۔ یہاں نہ گھمسنگی ہے۔ نہ انسانی حسد۔ جی چاہتا ہے کہ تمام رات اسی ریت پر لیٹا رہوں ــــ اور چاندنی میرے جسم کے رُوئیں رُوئیں میں تحلیل ہو جائے۔ اور صبح اٹھوں تو کوئی حسین دوشیزہ، خراماں خراماں میرے قریب آئے۔ اور مجھے سویا ہوا دیکھ کر میرا منھ چُوم لے۔ اور میں چونک کر اُٹھ بیٹھوں۔ اور اُسے اپنی آغوش میں لے لوں۔ اور پھر اُس کے سیاہ بالوں میں اُنگلیاں پھیرتا رہوں۔ ہوا آہستہ آہستہ ہم دونوں سے ہمکنار ہوتی رہے۔ سمندر اپنا وحشی راگ گاتا رہے۔ میں اُس کی طرف دیکھتا رہوں، اور وہ میری طرف دیکھتی رہے۔ حتےٰ کہ یہ لمحہ ایک ابدی لمحہ بن جائے۔"

"سلیم صاحب۔"

"فرمائیے۔" اُس نے خوش ہو کر کہا۔

"ایک بات کیجیے گا۔"

"جی، کون سی ؟"

"قبلہ آپ فوراً شادی کر لیجیے۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"آپ کا دماغ درست ہو جائے گا۔ آپ کا رومانی تخیل، حقیقت کی چٹانوں سے ٹکرا کر آپ کو ایک باہوش انسان بنا دے گا۔ شادی کے بعد آپ بہت سی باتیں بھول جائیں گے اور مجھے کامل اُمید ہے کہ شادی کے بعد آپ پورن ماشی کا چاند دیکھنے نہ آئیں گے۔"

"اگر شادی کے بعد انسان کی یہ حالت ہو جاتی ہے۔ تو میں اِس شادی سے لنڈورا ہی اچھا۔"

"دراصل تم حقیقت سے دوچار ہونا نہیں چاہتے۔ میں جب تمھیں شادی کیلئے کہتا ہوں۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں شادی کے خلاف جہاد کر رہا ہوں۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ شادی کے بعد تم ایک بہتر انسان بن سکو گے اور خاص کر یہ وقت جو تم یہاں ضائع کر رہے ہو اُسے کسی تعمیری کام میں صرف کر سکو گے۔ دراصل سلیم صاحب آپ بیمار ہیں۔"

سلیم نے یہ فقرہ سُنا تو فوراً اُٹھ بیٹھا اور ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ "واہ بھائی راج تم نے بھی خوب بات کی۔ راج صاحب میرے جسم کی طرف دیکھیے۔ کافی ہٹا کٹا ہوں۔ بازو، مضبوط اور توانا ہیں، ــــ پھیپھڑے ٹھیک کام کر رہے ہیں۔ سینے پر گوشت ہے۔ چہرے پر سُرخی ہے، آنکھوں میں چمک ہے۔ میں کئی میل پیدل چل سکتا ہوں۔ صبح و شام ورزش کرتا ہوں۔ پیٹ بھر کر کھانا کھاتا ہوں۔ مجھے کبھی بدہضمی کی شکایت نہیں ہوئی۔"

"اس کے باوجود بھی آپ بیمار ہیں۔"

"مجھے آج تک کبھی بخار نہیں ہوا!"

"قبلہ آپ جسمانی طور پر بیمار نہیں، بلکہ ذہنی طور پر بیمار ہیں۔"

"یہ بھی اچھی بات کہی، راج بھائی! ۔ میں پاگل نہیں ہوں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ نہایت صاف اور ستھرے کپڑے پہنتا ہوں۔ میری پینٹ کی کریز کبھی خراب نہیں ہوئی۔ بالوں میں چنبیلی کا تیل لگاتا ہوں۔ اور انہیں نہایت سلیقے سے سنوارتا ہوں۔ جیب میں ہمیشہ کنگھی رکھتا ہوں — تاکہ ضرورت کے وقت کام آئے۔ لوگوں سے نہایت ادب سے بات کرتا ہوں۔ اور بس یا ٹرام میں جب کوئی لڑکی ملتی ہے، تو نہایت ادب سے پیش آتا ہوں کبھی کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرتا۔ صرف جب کبھی سمندر کے کنارے آتا ہوں تو یہ خیالات مجھے چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ اور میں ان خیالوں میں کھو جاتا ہوں۔ اور چاندنی برستی رہتی ہے، اور میں سپنوں کے جال بناتا رہتا ہوں۔ جیسا کہ میں کہہ رہا تھا۔ اور آپ نے میری بات سنی نہیں ——

میں اپنا مکان بنوانا چاہتا ہوں۔ ڈرائنگ روم کو کس طرح سجاؤں گا۔ اس کے متعلق تو کچھ سن لیجئے۔ (پھر چاند کی طرف دیکھ کر کہتا ہے) اُف ظالم کتنی حسین رات ہے —— میرے ڈرائنگ روم میں سبز رنگ کا ہلکا ہلکا رنگ ہوگا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر سبز رنگ کے پردے، بالکل اس نیلگوں آسمان کی طرح اور دیواروں پر چغتائی کی تصویریں۔ اجنتا اور ایلورا کے حسین مرقعے۔ اور میرے بستر کے قریب والی دیوار پر انگوروں کی لٹکتی ہوئی

شاخیں۔ مصر اور شام کی دل نواز صبحیں۔ فرش پر کشمیر کے غالیچے اور چھت پر دور۔ دور۔ درختوں سے پرے، چاند، ایک ٹہنی کے پیچھے اٹکا ہوا ——— اور پھر اس ڈرائنگ روم میں ایک الماری ہوگی اُس میں مختلف مصنفوں کی کتابیں ہوں گی۔ ان کتابوں کو دوسرا شخص بالکل نہ ہاتھ لگا سکے گا۔ (سلیم سمندر کی طرف دیکھتا ہے اور پھر اچک کر کہتا ہے) راج۔ ذرا ادھر دیکھو۔ اس سمندر کی طرف دیکھو۔ بالکل لبالب بھر گیا ہے، اور لہریں ہماری طرف بڑھتی چلی آرہی ہیں۔ اُدھر دور۔ دور۔ درختوں سے پرے ——— اُن مکانوں سے پرے، بجلی کے قمقمے، کسی دوشیزہ کی آنکھوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ اُف یہ چاند۔ ہائے رے یہ چاندنی ——— راج بھائی۔ یہ تمھیں کبھی نصیب نہ ہوگی۔ اللہ۔ کیا میرے خوابوں کی تکمیل ہوگی۔ میں اس دنیا میں ایک چھوٹی سی جنت بنانا چاہتا ہوں۔ میں تمھیں اسے اپنے گھر بلاؤں گا راج بھائی۔ تم میرا مذاق اُڑالو۔ لیکن میں اپنی جنت ضرور بناؤں گا ——— اپنے گھر میں ریڈیو رکھوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ جب رات کا کھانا کھالوں۔ اور یہ میں تمھیں بتادوں کہ اپنی محبوبہ کے ہاتھوں کا پکایا ہوا کھانا کھاؤں گا۔ رات کے کھانے میں قورما ہوگا۔ بریانی ہوگی۔ قیمہ ہوگا۔ پلاؤ ہوگا۔ ٹماٹر۔ پیاز۔ ادرک کٹا ہوا نیمو ہوگا۔ اور اس کے بعد سوئٹ ڈش ہوگی ——— انڈوں کا حلوہ اور فیرنی۔ اور اس کے بعد ایک الائچی کھا کر۔ مُنہ میں خوشبو بکھیروں گا ——— سُن رہے ہو راج بھائی؟"

"سُن رہا ہوں۔" میں نے جل کر کہا۔

"تو ہاں، جب میں کھانا کھاؤں گا۔ اور منہ میں الائچی رکھ لوں گا۔ تو بستر پر لیٹ جاؤنگا ٹیبل لیمپ کی ہلکی ہلکی سبز روشنی میں بستر پر لیٹ جاؤنگا میرے بستر پر ہمیشہ ایک سفید چادر رہیگی۔ دودھ کیطرح سفید چادر، اور چادر پر کیا ہوگا چنبیلی کے سفید پھول اسکی خوشبو سے دماغ مہک اٹھیگا۔ اور پھر چھن سی آواز آئے گی"۔

"یہ کیا بکواس ہے"۔ میں نے غصہ میں آکر کہا۔

"بھائی، یہ میری محبوبہ کی چوڑیوں کی آواز ہے۔ ادھر چوڑیاں چھنکیں، ادھر سے ایک سفید ہاتھ، میریطرف بڑھا چھن۔ سفید ہاتھ نے ایک گلاس میرے ہاتھ میں دیا۔ یہ دودھ کا گلاس ہے، جو میں سوتے وقت پیا کرونگا میں ایک ہی سانس میں دودھ پی لونگا۔ اگر دودھ ٹھیر ٹھیر کر پیا جائے، تو پیٹ میں ہوا بھر جاتی ہے، دودھ پیا۔ پھر چھن کی آواز آئی، یعنی محبوبہ نے دودھ کا خالی گلاس پکڑ لیا۔ اور چھن چھن چھن چھن کرتی ہوئی وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔ صرف فضا میں چوڑیوں کی آواز جھنکتی رہ گئی"۔

"سلیم"۔ میں نے غصہ میں آکر کہا۔

"کیا بات ہے"۔ اس نے نرم لہجہ میں کہا۔

"یہ بکواس بند کرو"۔ میں نے چیخ کر کہا۔

وہ ہنس پڑا۔ بڑی معصوم تھی اسکی ہنسی۔ وہ ہنسی جو وہ ستائیس سال سے ہنس رہا تھا اس ہنسی میں چاند کی ٹھنڈک تھی۔ پاک اور صاف ہنسی۔ دوشیزہ کیطرح نیک اور نرم ہنسی۔ اس ہنسی میں تلخی نہ تھی۔ زہر نہ تھا بلکہ ایک بھرپور زندگی بسر کرنے کی آرزو تھی۔ یہ ہنسی ہر شخص کے لبوں پر ہوتی ہے۔ شاید آپنے بھی یہ ہی ہنسی ہوگی لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ ہنسی مر جاتی ہے اسکی جگہ تلخی آجاتی ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو راج بھائی"۔

"یہی کہ تم ابھی تک بچے ہو۔"

"چھوڑو، ان باتوں کو۔ تم یہ بتاؤ کہ تم اس ماحول میں کس چیز کو دیکھنا پسند کرو گے۔"

"پہلے تم بتاؤ میں تمھارا موڈ تباہ کرنا نہیں چاہتا۔"

اُسنے اپنی پیشانی سے بالوں کو جھٹک پیچھے کیا اور اپنی دائیں ہتھیلی کو ملتے ہوئے کہنے لگا

"میں چاہتا ہوں کہ اسوقت کلو پیٹرہ اپنے بہترین لباس پہنکر میرے سامنے سے گذرے"

"اور اگر وہ نہ آئے۔"

"تو میلن آف ٹرائے آجائے۔"

"اگر وہ بھی نہ آئے۔"

"تو ڈورتھی لیمار۔"

"اسکی اُمید تو ہو سکتی ہے، کیونکہ وہ ابھی تک زندہ ہے۔ فرض کرو اگر وہ نہ آئے تو۔"

"تو نرگس ہی سہی۔"

"اگر نرگس کی جگہ کوئی گھاٹن آجائے تو۔"

"پرماتما کیلئے میرے تخیل کو برباد نہ کرو۔ اس حسین رات کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کرو۔" سلیم نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا راج بھائی، تم اسوقت کیا سوچ رہے ہو۔ کوئی اچھی سی بات بتانا۔"

"میں سوچ رہا تھا ایک . . . ."

"ہاں ہاں بتاؤ۔ جلدی بتاؤ۔"

"ایک لاش کے متعلق۔"

"لاحول ولاقوۃ! اس چاندنی رات میں ایک لاش کا ذکر۔ راج بھائی اپنے دماغ کا علاج کراؤ۔ تم کہتے تھے کہ میں مریض ہوں۔ دراصل تم مریض ہو، تم۔ ایسی رات میں ایک انسانی لاش کا ذکر۔"

"جی ہاں میں نے وہ لاش آج شام کو دیکھی تھی۔ اسلئے میں اُسے بھول نہیں سکتا"

"کہاں پر؟" سلیم نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"میرین لائن اسٹیشن کے قریب۔ وہ سڑک کے کنارے پڑا ہوا تھا۔ اُسکا مُنہ کھُلا ہوا تھا۔ اُسکے لبوں پر ہنسی تھی۔ بالکل تمھاری ایسی۔ اُسکی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔"

"کوئی بوڑھا ہوگا" سلیم نے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا۔

"نہیں، وہ بوڑھا نہ تھا۔ اُسکی عمر ہوگی تیس پینتیس برس میں نے اُسے قریب سے دیکھا۔ اُسکے چہرے پر داڑھی نہ تھی، چہرے کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں۔ بال گندے اور میلے سے تھے۔ سارے جسم پر ایک گندا کمبل تھا جسپر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اُسکے قریب میں ایک گندا لوٹا پڑا ہوا تھا۔ شاید اسمیں پانی تھا۔ ایک کتا اُسمیں مُنہ و زبان ڈالکر چاٹ رہا تھا۔ میں نے لاش کیطرف دیکھا لیکن لوگ ناک بھوں چڑھا کر آگے بڑھ گئے۔ ان لوگوں کے لئے یہ ایک انسان کی لاش نہ تھی، بلکہ کسی کتے یا بلی کی۔ سڑک پر کاریں گذر رہی تھیں۔ بسیں گذر رہی تھیں۔ لوگ جوق در جوق آگے پیچھے بڑھ رہے تھے لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ ہنستی کھیلتی مُسکراتی ہوئی چلی جارہی تھیں۔ سیٹھ اور بنیئے اپنی اپنی موٹروں میں بیٹھے ہوئے گھروں کیطرف جارہے تھے لیکن کسی نے اس انسان کیطرف نگاہ نہ کی۔ یہ نہ سوچا یہ انسان یہاں کیوں پڑا ہوا ہے، کیا یہ زندہ ہے یا مرگیا ہے۔ سبھی اپنے کاموں میں مشغول نظر آتے تھے۔"

"اسی طرح لاکھوں انسان مر جاتے ہیں" سلیم نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"کیوں مرتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی یہ سوچا؟"

"سوچنے سے کیا فائدہ" سلیم نے لاپرواہی کے انداز میں کہا۔

"جب کبھی تم مجھے کہتے ہو۔ کہ اس چاند کیطرف دیکھو تو میری نظروں کے سامنے اس انسان کی لاش گھوم جاتی ہے۔ میں سمندر کو بھول جاتا ہوں۔ اس چاندنی کو بھول جاتا ہوں میں ان درختوں کو بھول جاتا ہوں میں ان لہروں کو بھول جاتا ہوں میں کلوپیٹرہ کو بھول جاتا ہوں میں ہیلن کو بھول جاتا ہوں میں ڈارتھی لمیار کو بھول جاتا ہوں، میں نرگس کو بھول جاتا ہوں۔"

"قبلہ، دماغ کا علاج کرائیے دماغ کا" سلیم نے طنزیہ انداز میں یہ فقرہ کہا

"میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ آدمی کیوں مرا۔ اسکے رشتہ دار کہاں تھے۔ اُسکی بیوی کہاں تھی اُسکے بچے کہاں تھے جب وہ بیمار ہوا تو اس کا علاج کیوں نہ کرایا گیا۔ اُسکی دیکھ بھال کیوں نہ کی گئی، یہ کتنا ستم ہے، کہ انسان سڑک پر پڑا پڑا مر جائے اور دنیا اُسکی طرف نگاہ اُٹھا کر نہ دیکھے۔"

"بھائی اس چاند کیطرف دیکھو کتنی حسین اور خوابناک رات ہے" سلیم نے کھیلے ہوئے سمندر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں دیکھ رہا ہوں۔ اور سب کچھ دیکھ رہا ہوں! اور کیا تم ان مکانوں کو دیکھ رہے ہو۔ جو بیچ کے کنارے اُونگھ رہے ہیں۔ جانتے ہو، انکے اندر کیا ہے۔ جانتے ہو۔ کتنے آرام سے یہ شخص اپنی زندگی گذارتے ہیں۔ یہ شخص باہر آکر تمھاری طرح چاند کا نظارہ کیوں نہیں کرتے جانتے ہو وہ تمھاری طرح قورمہ، پلاؤ، فیرنی، بریانی اور حلوے کا ذکر نہیں کرتے۔۔

انکی نگاہوں میں کھانے پینے کی چیزوں کیلئے اتنی بھوک نہیں ہوتی ۔ وہ چھن چھن کی آواز پر پاگل نہیں ہوجاتے ۔ جانتے ہو اسکی وجہ کیا ہے، کیونکہ انہیں ہر شخص ان چیزوں کو ہر روز کھاتا ہے۔ اور جب انہیں سے کوئی بیمار ہوجاتا ہے، تو علاج کرنے کیلئے ڈاکٹر آتاہے ۔ نرس پیار سے خدمت کرتی ہے، رہنے کیلئے الگ کمرہ ملتا ہے اور اگر پھر بھی مریض اچھا نہ ہو تو اُسے پہاڑ پر بھیجا جاتا ہے ۔ اور اگر اس علاج کے بعد وہ مرجائے تو نہایت شان وشوکت سے اُسے جلایا جاتا ہے ، یا اسکی قبر بنوائی جاتی ہے ۔ سنگ مرمر کی سِل سے اسکی قبر کو آراستہ کیا جاتا ہے ۔ اور اگر وہ ہندو ہے، تو اسکی راکھ کو کسی پوتر استھان میں بھیجا جاتا ہے ۔"

"اب اس قسم کی باتیں نہ کرو ۔ اُس لہر کو دیکھو جو تڑپ تڑپ کر واپس جا رہی ہے"

"اس انسان کو دیکھو ، جو بے یار و مددگار مرگیا ۔"

"یہ پھیلا ہوا سمندر ۔ اور یہ خاموش ساکن ساحل ، اور یہ ٹھنڈی ٹھنڈی نسیم ۔"

"خشک تپتی ہوئی سڑک ۔ اور پسینے سے بھیگے ہوئے جسم ۔ اور ایک انسان کی لاش مکھیاں بھنبھناتی ہوئیں اور اُسکا مُنہ کُھلا ہوا ۔"

"بھائی رنگ میں بھنگ نہ ڈالو ۔" سلیم نے تنگ آکر کہا ۔

"ایسی بات نہیں ، میں چاہتا ہوں کہ تم اس چاند کو بھی دیکھو اور اس لاش کو بھی اس حسن کو بھی دیکھو اور اس گندگی کو بھی ۔ اگر اس چاندنی کو دیکھ کر کلوپٹرہ یاد آجاتی ہے تو اُس مزدور لڑکی کا بھی خیال کرو جو دن رات ، کام کرتی ہے لیکن دو وقت کھانا نصیب نہیں ہوتا ۔ تمہیں اپنا گھروندہ بنانیکا حق ہے لیکن تم اپنا گھروندا الگ کیوں بناتے ہو ، انہیں صرف اپنی جھلک کیوں دیکھتے ہو ، اپنی جنت کیوں بناتے ہو ، جسمیں صرف تم رہ سکو ۔"

"رہنے دو راج بھائی۔ تم میرے تخیل کو برباد کر دوگے۔ تم میرے سپنے کو اُجاڑ دوگے پرماتما کیلئے خاموش ہو جاؤ۔ اور خاموشی سے اس چاندنی کو دیکھو۔ یہ چاندنی جو آہستہ آہستہ برس رہی ہے۔ اور برستی رہیگی۔ یہ سمندر، یہ لہریں، جنکے اندر صدیوں کا طوفان بند ہے۔ یہ بھی تو اسوقت ساکن ہو گیا ہے۔ میں اسوقت لاش کو دیکھ نہیں سکتا۔ یہ لاش بہت گھناؤنی اور ڈراؤنی دکھائی دیتی ہے اسکی صورت سے مجھے گھن آتی ہے۔ اسکے جسم سے بدبو نکلتی ہے۔ اور آج تو پورن ماشی کا چاند ہے۔ آج خوشبوؤں کی رات ہے مہکتی ہوئی رات۔ تاروں بھری رات۔ آج پھولوں کا ذکر کرو حسین جسموں کا ذکر کرو مہکتی فضاؤں۔ آبشاروں، سبزہ زاروں گھنی وادیوں اور ریشمی آنچلوں۔ خوبصورت کمروں، غالیچوں کا ذکر کرو۔ میں صرف اپنا چاند چاہتا ہوں۔ میں صرف اس چاندنی میں نہانا چاہتا ہوں میں صرف اس ریت پر لیٹ کر اس ٹھنڈک سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ میں ان لہروں کو دیکھنا چاہتا ہوں میں صرف اپنے مکان میں رہنا چاہتا ہوں میں صرف اپنی محبوبہ چاہتا ہوں۔ ہائے میری محبوبہ۔ اُف یہ چاند۔ میرے تخیل کو پارہ پارہ نہ کرو۔۔۔

تمھارا تخیل نیا نہیں ہے وہ کافی پُرانا ہے تمھارا دُرآہنگ رِزم نیا نہیں ہے وہ کافی پُرانا ہے۔ اُسکی عمر ہزاروں برس کی ہے۔ جب سے انسان پیدا ہوا۔ اُس نے اس تخیل کو جنم دیا۔ تمھارا مکان نیا نہیں ہے وہ بھی پُرانا ہے۔ تمھاری محبوبہ نئی نہیں ہے۔ وہ بھی پرانی ہے۔ یہ چاند نیا نہیں۔ یہ چاندنی نئی نہیں۔ یہ سمندر، یہ ریت۔ یہ لہریں نئی نہیں لیکن یہ لاش ہی ہے اس لاش میں حیوانیت کی بُو آتی ہے کمینگی کی بُو آتی ہے ظلم اور استبداد کی بُو آتی ہے جب تک یہ لاش یہاں پر ہے۔ نہ مجھے چاند اچھا لگیگا نہ چاندنی۔" اور یہ سُنکر سلیم اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسکا چہرہ اُداس ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں حُزن و ملال کی جھلک سی۔ کہنے لگا۔ "آؤ

انکی نگاہوں میں کھانے پینے کی چیزوں کیلئے اتنی بھوک نہیں ہوتی۔ وہ چھن چھن کی آواز پر پاگل نہیں ہوجاتے۔ جانتے ہو اسکی وجہ کیا ہے، کیونکہ انہیں ہر شخص ان چیزوں کو ہر روز کھاتا ہے۔ اور جب انہیں سے کوئی بیمار ہوجاتا ہے، تو علاج کرنے کیلئے ڈاکٹر آتا ہے۔ نرس پیار سے خدمت کرتی ہے، رہنے کیلئے الگ کمرہ ملتا ہے اور اگر پھر بھی مریض اچھا نہ ہو تو اُسے پہاڑ پر بھیجا جاتا ہے! اور اگر اس علاج کے بعد وہ مرجائے تو نہایت شان و شوکت سے اُسے جلایا جاتا ہے، یا اُسکی قبر بنوائی جاتی ہے۔ سنگ مرمر کی سِل سے اسکی قبر کو آراستہ کیا جاتا ہے! اور اگر وہ ہندو ہے، تو اسکی راکھ کو کسی پوتر استھان میں بھیجا جاتا ہے۔"

"اب اس قسم کی باتیں نہ کرو۔ اُس لہر کو دیکھو جو تڑپ تڑپ کر واپس جا رہی ہے"

"اس انسان کو دیکھو، جو بے یار و مددگار مر گیا۔"

"یہ پھیلا ہوا سمندر، اور یہ خاموش ساکن ساحل، اور یہ ٹھنڈی ٹھنڈی نسیم۔"

"خشک تپتی ہوئی سڑک، اور پسینے سے بھیگے ہوئے جسم، اور ایک انسان کی لاش مکھیاں بھنبھناتی ہوئیں اور اُسکا مُنہ کھُلا ہوا۔"

"بھائی رنگ میں بھنگ نہ ڈالو" سلیم نے تنگ آکر کہا۔

"ایسی بات نہیں میں چاہتا ہوں کہ تم اس چاند کو بھی دیکھو اور اس لاش کو بھی اس حسن کو بھی دیکھو اور اس گندگی کو بھی! اگر اس چاندنی کو دیکھ کر کلوپٹرہ یاد آجاتی ہے تو اُس مزدور لڑکی کا بھی خیال کرو جو دن رات، کام کرتی ہے لیکن دو وقت کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ تمھیں اپنا گھروندہ بنانیکا حق ہے لیکن تم اپنا گھروندا الگ کیوں بناتے ہو، انہیں صرف اپنی جھلک کیوں دیکھتے ہو، اپنی جنت کیوں بناتے ہو جسمیں صرف تم رہ سکو۔"

"رہنے دو راج بھائی۔ تم میرے تخیل کو برباد کر دوگے۔ تم میرے سپنے کو اُجاڑ دوگے پرماتما کیلئے خاموش ہو جاؤ۔ اور خاموشی سے اس چاندنی کو دیکھو۔ یہ چاندنی جو آہستہ آہستہ برس رہی ہے۔ اور برستی رہیگی۔ یہ سمندر، یہ لہریں، جنکے اندر صدیوں کا طوفان بند ہے۔ یہ بھی تو اسوقت ساکن ہو گیا ہے۔ میں اسوقت لاش کو دیکھ نہیں سکتا۔ یہ لاش بہت گھناؤنی اور ڈراؤنی دکھائی دیتی ہے۔ اسکی صورت سے مجھے گھن آتی ہے۔ اسکے جسم سے بدبو نکلتی ہے۔ اور آج تو پورن ماشی کا چاند ہے۔ آج خوشبوؤں کی رات ہے مہکتی ہوئی رات۔ تاروں بھری رات۔ آج پھولوں کا ذکر کرو حسین جسموں کا ذکر کرو مہکتی فضاؤں۔ آبشاروں، سبزہ زاروں گھنی وادیوں اور ریشمی آنچلوں۔ خوبصورت کمروں، غالیچوں کا ذکر کرو۔ میں صرف اپنا چاند چاہتا ہوں۔ میں صرف اس چاندنی میں نہانا چاہتا ہوں۔ میں صرف اس ریت پر لیٹ کر اس ٹھنڈک سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ میں ان لہروں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں صرف اپنے مکان میں رہنا چاہتا ہوں۔ میں صرف اپنی محبوبہ چاہتا ہوں۔ ہائے میری محبوبہ۔ اُف یہ چاند۔ میرے تخیل کو پارہ پارہ نہ کرو۔"

تمھارا تخیل نیا نہیں ہے وہ کافی پرانا ہے تمھارا اندر آہنگ زم نیا نہیں ہے وہ کافی پرانا ہے۔ اُسکی عمر ہزاروں برس کی ہے۔ جب سے انسان پیدا ہوا، اُس نے اس تخیل کو جنم دیا۔ تمھارا مکان نیا نہیں ہے وہ بھی پرانا ہے۔ تمھاری محبوبہ نئی نہیں ہے۔ وہ بھی پرانی ہے۔ یہ چاند نیا نہیں۔ یہ چاندنی نئی نہیں۔ یہ سمندر، یہ ریت۔ یہ لہریں نئی نہیں لیکن یہ لاش ہی ہے اس لاش میں حیوانیت کی بُو آتی ہے کمینگی کی بُو آتی ہے ظلم اور استبداد کی بُو آتی ہے جب تک یہ لاش یہاں پر ہے۔ نہ مجھے چاند اچھا لگیگا نہ چاندنی۔" اور یہ سُنکر سلیم اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسکا چہرہ اُداس ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں حُزن و ملال کی جھلک سی۔ کہنے لگا۔ "آؤ

چلیں۔ آج کی رات واقعی حرام ہو گئی۔"

اور ہم دونوں چل پڑے۔ سلیم سوچ رہا تھا کہ کس پاگل کے پلّے پڑ گیا۔ سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ ہم دونوں خاموش سڑک پر چلتے رہے سر جھکائے۔ چاندنی بدستور برس رہی تھی۔ اور چاند درختوں کی اوٹ میں آگیا تھا۔ اور سمندر کی لہریں اُسی وقت کے ساتھ ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ لیکن ان کے ساتھ ہی ایک لاش، بغیر کفن، ننگی۔ بدبودار، ڈراؤنی اور وحشتناک اکیلی۔ چاند کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔

صفحات :- ۴۸

اُس کا نام پشپا تھا۔ اُس کے باپ کا نام دینا رام مل تھا، اگر اُس کے باپ کا نام شیر گل ہوتا، تو اُس کا نام سلمہ ہوتا،۔ نجمہ ہوتا، اختری ہوتا،۔ اگر اُس کے باپ کا نام گوریچن سنگھ ہوتا تو اُسکا نام ہرنام کور ہوتا، لیکن اُس کا نام پشپا تھا'۔ کانتا تھا۔ جانکی تھا!۔ اور اُس کے باپ کا نام شام دیتا مل، گوران دیتا مل، لکھول دیتا۔ تھا۔ جبھی کلوا اور اُس کے ساتھی زبردستی اُسے اس محلے میں اٹھا لائے تھے!۔ کبھی کبھی وہ اس کال کوٹھڑی میں بیٹھ کر سوچتی، کہ کاش اُس کے باپ کا نام شمس الدین ہوتا،۔ تو ضرور اُسے ان تکلیفوں، اور اس المناک زندگی سے نجات ملتی۔ آخر ان ناموں میں کیا دھرا ہے،۔ کیوں رام دیتا مل، شمس الدین کے خون کا پیاسا ہے،۔

اس سے پہلے نہ وہ گلے کو جانتی تھی، اور نہ ہی اُس کے ساتھیوں کو

ـــــــــ شادی سے پہلے وہ گوجرخاں میں رہتی تھی، اس چھوٹے سے شہر میں ہندوؤں کا راج تھا۔ گو شہر میں زیادہ آبادی مسلمانوں کی تھی، لیکن ہندوؤں کے ہاتھوں سارا بیوپار تھا!۔ شہر کے وہ چوہدری تھے،۔ بڑی بڑی دوکانیں اُن کی تھیں، کپڑے کا بیوپار، نسوار کا بیوپار، گھی کا بیوپار، اناج کا بیوپار ــ دراصل، ساری اہم چیزوں پر ہندوؤں کا قبضہ تھا،۔ اب بیچارے مسلمان کرتے تو کیا کرتے،۔ زمینوں کے بڑے بڑے ٹکڑے ہندوؤں کی ملکیت تھے اور مسلمان کسان اُس میں ہل جوتتے تھے کھیتی باڑی کرتے تھے،۔ اور اسی کھانے پینے کے چکر میں زندگی گذار دیتے تھے،۔ ــ یہ عجیب سی بات تھی، کہ گوجرخاں میں کبھی ہندو مسلمان فساد نہ ہوا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کافی اتحاد تھا۔ ہندو مسلمانوں کے گھر آتے تھے، اُن کی شادی بیاہ میں شریک ہوتے تھے،۔ ــ اور اسی طرح مسلمان بھی ہندوؤں کے گھروں میں آتے، شادی کے موقعے پر تحفے دیتے، غمی کے موقعے پر آکر اپنے غم کا اظہار کرتے،۔ بڑے بڑے تہواروں پر یہ لوگ اکٹھے کھاتے پیتے تھے۔ رکھڑی کے تہوار پر ہندو لڑکیاں مسلمان لڑکوں کو اپنا بھائی بناتیں،۔ اور ہولی کے دنوں پر ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے،۔ بسنت کے تہوار پر یہ لوگ اکٹھے پتنگ اڑاتے ــ ــ اور اس طرح اس چھوٹے شہر میں زندگی کافی دلچسپ تھی،۔ لوگوں کو ایک دوسرے سے پیار تھا،۔ ظاہری طور پر تو کچھ ایسا ہی معلوم پڑتا تھا۔

پشپا کو اچھی طرح یاد ہے،۔ کہ وہ اکثر کنوؤں پر پانی بھرنے جاتی تھی،

تو مسلمان چھو کر بے راستے میں کھڑے ہو کر اُس کو تا کتے ،۔پشپا کو اتنا معلوم ہو گیا تھا۔کہ وہ باقی لڑکیوں سے بہت ہی خوبصورت تھی ،کیونکہ اس شہر کا سب سے خوبصورت لڑکا ،صفدر اُس کی راہ اکثر روکتا تھا ،۔صفدر کا باپ کسان تھا ،۔اور پشپا کے باپ کی زمین میں ہل چلاتا تھا ،۔اور صفدر بھی تو کھیتی باڑی کو اپنا پیشہ سمجھتا تھا ،۔۔ اُس کی نظر بھی پشپا پر تھی ،۔وہ ہر روز کنوئیں پر جاتا ،۔ اکثر تہمد اور ایک بھڑکیلی قمیص پہن کر۔اُس کے ہاتھ اکثر بنسری ہوتی ،۔ بالوں کو ماتھے پر جھٹک کر کھیت کے کنارے بیٹھ کر وہ بنسری بجاتا ،۔اور جب پشپا اُس کے قریب سے گذرتی ،۔ تو وہ کن انکھیوں سے اُس کی طرف دیکھتا ،۔پشپا اُس کی طرف دیکھتی ،۔ نگاہیں ملتیں ،پشپا شرما کر آگے بڑھ جاتی ،اور صفدر ،بانسری کو مُنھ سے لگاتا۔ اور اپنی ان جانی محبت ،اپنا دُکھ۔اپنی خوشی ،۔ اپنی تمنائیں۔ اپنی سب آرزوئیں ،اُس سنگیت کی لے میں بھر دیتا ،۔ سامنے مکئی کے کھیت ،آنکھوں کو تازگی بخشتے !۔دور شفق کی سُرخی ،آہستہ آہستہ اندھیرے میں مدغم ہو جاتی !۔

صفدر نے کبھی اپنے دل کی بات پشپا سے نہ کہی ،۔اور نہ ہی پشپا کو اتنی جُرأت ہوئی۔ کہ وہ صفدر سے اپنے دل کا حال کہ سکے ۔ وقت گذرتا گیا ،۔محبت جوان ہوتی گئی ،۔آنکھ کی ایک جُنبش ،دلوں کا حال کہ دیتی ،۔ دونوں جب ایک دوسرے کے قریب سے گذرتے ،۔۔ تو ہلکے ہلکے قدموں کی چاپ ،۔اُس سرسبز گھاس پر ،۔صفدر کو سُنائی دیتی ،۔گھاس کی سرسراہٹ ،۔سے اُس کے دل کی دھڑکن کو تیز کر دیتی ،۔۔ اور

وہ سر جھٹک کر، بنسری کو منہ سے لگا کر، آنے والے انسان کی طرف دیکھتا ــــ وہ واقعی پشپا ہوتی، یہ انتظار جو اُسے کرنا پڑتا تھا، کتنا پیارا اور دلکش تھا یہ انتظار۔ دونوں پر ایک دوسرے کی موجودگی کے احساس کا ایک نشہ طاری ہو جاتا۔ دونوں ان لمحات میں یہ بھول جاتے، کہ ایک کا نام پشپا ہے، اور دوسرے کا صفدر ــــ ایک مندر کا پجاری ہے دوسرا مسجد کا۔ وہ لمحات کتنے رنگین تھے، کتنے حسین، ــــ کتنے پیارے اور کتنے میٹھے، ــــ وہ زیادہ عرصہ کنویں پر نہ ٹھیرتی، اگر کسی کو اس عشق کا علم ہو گیا۔ تو خیر نہیں ــــ یہ عشق جو ایک ہندو اور مسلمان کے درمیان ہو جاتا ہے، کتنا خطرناک ہوتا ہے! ــــ لیکن یہ عشق چھپ نہ سکا۔ گوجرخاں کے لوگوں کو اس بات کا علم ہو گیا۔

اور جب یہ واردات پشپا کے والدین کو معلوم ہوئی۔ تو انھوں نے سر پیٹ لیا، سب سے پہلی بات جو انھوں نے کی۔ وہ تھی، پشپا کا کنویں پر جانے سے روکنا ــــ اور پشپا اپنے گھر کی چار دیواری میں مقید کر دی گئی، اور بات بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھی، کہ عام لوگ بھی اس عشق کا چرچا کرنے لگے، اور خاص کر ہندو گھرانوں میں تو ایک کہرام مچ گیا۔

ایک کہتا:۔ "ارے یار۔ پشپا کا اتنا حوصلہ۔ کہ وہ ایک مسلمان لونڈے سے عشق کرے،"

دوسرا:۔ "سالی کو جان سے مار دو۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔"

تیسرا:۔ "کتیا کی ناک کاٹ ڈالو۔"

چوتھا کہتا :۔ "فوراً کسی ہندو لونڈے سے شادی کر دو۔ گھر کا مال گھر میں رہے۔"

پانچواں ،، :۔ "اِس مسلمان لونڈے کو کوڑے مار مار کر شہر سے باہر نکال دو۔"

اور اس طرح اَن گنت باتیں ہوتیں ا۔ گوپُشپا اب کنویں پر نہ جاتی تھی، بلکہ دن بھر گھر میں رہتی تھی، لیکن لوگوں کو یقین نہ آتا تھا، — وہ ہر روز ایک نت نئی بات اُڑا دیتے۔

"ارے یار۔ جب پشپا کے والدین رات کو سو جاتے ہیں، تو یہ لڑکی دیوار پھاند کر یار سے ملنے جاتی ہے۔"

"بھائی صاحب، کل ہی میں اُدھر سے گذر رہا تھا۔ کہ اچانک میری نظر پُشپا کے گھر کی طرف گئی، تو دیکھا، کہ وہ دیوار سے ساتھ لگ کر ایک لونڈے سے باتیں کر رہی تھی، ۔" "کون تھا وہ لونڈا!" دوسرا چلایا۔ "وہی صفدر ہو گا۔ اور کون ہو سکتا تھا، سالی نے عشق بھی کیا، تو ایک کسان لڑکے کے ساتھ۔ کسی پڑھے لکھے نوجوان سے عشق کرتی تو بات بن جاتی، ۔ ابھی کل ہی گوراں دیتا مل کا لڑکا لاہور سے واپس آیا ہے، کیسی انگریزی بولتا ہے، اور جب سُوٹ پہن کر بازار میں نکلتا ہے تو سالے انگریز بھی اُس کے آگے مات ہو جاتے ہیں، گورا چِٹّا رنگ گٹ پٹ کرتا ہوا، ہاتھ میں ٹینس کا ریکٹ لئے ہوئے، دوسرے ہاتھ میں رومال، پکڑے ہوئے گذرتا ہے، تو پرمیشور کی قسم، کیا سجتا ہے،

لونڈا ــــ پشپا کی اس سے شادی ہو جائے، تو قسمت بن جائے، زندگی سنور جائے ــ نہ جانے ان لونڈیوں کو کیا ہوا ہے، یہ گنوار لڑکوں کی پیچھے ماری ماری پھرتی ہیں، اور لونڈے بھی کیسے ،۔ اُجڈ ۔ گنوار ۔ بدمعاش ۔ اَن پڑھ ۔ اور پھر مسلمان ۔ ــــ"

تو اس طرح جو کچھ کسی کے ذہن میں آتا، وہ بک دیتا ۔ آخر ان باتوں سے تنگ آکر شہر کے بڑے بڑے آدمیوں نے ایک وفد تیار کیا ۔ کہ وہ پشپا کے والد کے پاس جائے ۔ اور اُسے سمجھایا جائے ۔ کہ بھائی ۔ لڑکی کی فوراً شادی کر دو، نہیں تو لڑکی خود مُنھ کالا کر دے گی ۔

تاریخ مقرر ہوئی، وقت مقرر کیا گیا، اور شہر کے پانچ چھ با رسوخ آدمی، پشپا کے گھر پہنچے ۔ پشپا کا والد گھر میں موجود تھا ۔ اُن لوگوں کو دیکھ کر وہ معاملے کو بھانپ گیا، حقے کی گڑگڑاہٹ میں سارا معاملہ پیش ہوا ۔ بحث ہوئی ۔ فقرے کسے گئے، پشپا کے والد کو لعنت ملامت کی گئی، ہندو دھرم کو بچانے کے لئے، مختلف تجاویز پیش کی گئیں ۔ اور سب سے بڑی تجویز یہ تھی ۔ کہ پشپا کی فوراً شادی کی جائے، اور مزید انتظار ہندو جاتی کے لئے موت کے مترادف ہوگا ۔ اور پھر دبی ہوئی آواز میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت پر غور کیا گیا ۔ کہ کس طرح یہ لوگ اپنے حقوق کیلئے لڑ رہے ہیں، اپنا الگ حصہ مانگ رہے ہیں، پاکستان اور ہندوستان کے بننے پر بحث کی گئی ۔ لیکن آخر کار معاملہ اس بات پر جا کر ٹھیرا ــــ کہ پاکستان فی الحال نہیں بن سکے گا ۔ سب سے پہلی بات یہ ہے ۔ کہ

پشپا کی کسی ہونہار لڑکے سے شادی کر دی جائے۔ اس بحث کے بعد لوگوں نے ٹھنڈا جل پیا، اور مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے، موٹی موٹی پگڑیوں کو سنبھالتے ہوئے، کن انکھیوں سے اس گھر کی چار دیواری کو دیکھتے ہوئے، سبھی لوگ گھر سے باہر نکل آئے، لیکن دل میں ایک بات ضرور رہی۔ کہ پشپا کہیں نظر نہیں آئی۔ کم از کم وہ سب اُسے ایک بار تو دیکھ لیتے۔ اور جاتے وقت سیٹھ ہری نارائن نے پشپا کے والد سے پوچھ ہی لیا، "پشپا۔ بچی۔ کہاں ہے" اور پشپا کے والد نے لجاتے ہوئے فوراً جواب دیا، "جی وہ تو سویٹر بُن رہی تھی۔" "بہت اچھا۔ بہت اچھا — بڑی سگھڑ لڑکی ہے۔ پرماتما اُس کی عمر دراز کرے"۔ اور کچھ کھانستے ہوئے سیٹھ ہری نارائن آگے بڑھے — راستے میں مُلومل نے کہا۔ "لالہ جی، آپ بھی تو ایک ٹوٹی ہیں۔"

"کیا ہوا مُلومل جی۔"

"آپ نے آخر کار پشپا کے متعلق پوچھ ہی لیا۔"

"پوچھتا نہ۔ تو کیا کرتا"۔ سیٹھ صاحب نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "سُنا ہے، — مُلومل جی، کہ بڑے معرکے کی چیز ہے۔"

"تری قسم — سارے شہر میں اس لونڈیا کا جواب نہیں۔ میں بھی تو لاہور تک ہو آیا ہوں۔ لیکن اس لونڈیا ایسے نخرے نہیں دیکھے۔ جب دیکھتی ہے، تو دیکھتی رہتی ہے۔ آنکھیں تک نہیں جھپکتی۔"

"آج درشن ہو جاتے، تو کیا بات تھی۔"

"سالی گھر میں نہیں تھی"۔ مُلومل نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"گئی ہوگی اپنے یار کے پاس"۔

"سوئیٹر کا تو محض بہانہ ہی تھا"۔

"اجی صاحب، یہ تو ہمیں محض اُلو بنانا تھا، میں نے تو یہاں تک سُنا ہے، کہ صفدر گھر میں آکر رل جاتا ہے"۔

"لیجئے۔ اب بتائیے"۔

"لالہ جی، عشق ہو، تو ایسا ہو"۔

"ہاں بھائی، ہم لوگوں نے تو یونہی زندگی گذاری، نہ عشق کیا نہ محبت، نہ ہجر نہ وصال، ماں باپ نے ہماری شادی کر دی، اور ہم نے کر لی، اور بیوی ایسی ملی، کہ طبیعت صاف ہو گئی۔ محض کوڑا کرکٹ"۔ اور سیٹھ نے دو تین گالیاں اپنی بیوی کو دیں، اور ساتھ ہی اپنے والدین کو۔

اتنے میں موڑ آگیا۔

"اچھا مُلومل جی، جے سیتا رام"۔

"جے سیتا رام، سیٹھ جی"۔

اور اس طرح باتیں کرتے ہوئے یہ لوگ نظروں سے اوجھل ہو گئے، لیکن اس واقعے کے بعد پُشپا پر کیا گذری۔ باپ نے پشپا کو کتنی گالیاں دیں، ماں نے اپنا سر کتنی بار پیٹ لیا، اور پشپا کے دل میں صفدر کی یاد کس طرح آئی، اور اس کا کیا ردِ عمل ہوا۔ ان باتوں کو بہت کم لوگ

"سالی گھر میں نہیں تھی"۔ ملومل نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"گئی ہوگی اپنے یار کے پاس"۔

"سویٹر کا تو محض بہانہ ہی تھا"۔

"اجی صاحب، یہ تو ہمیں محض اُلو بنانا تھا، میں نے تو یہاں تک سُنا ہے، کہ صفدر گھر میں آکر مل جاتا ہے"۔

"لیجئے۔ اب بتائیے"۔

"لالہ جی، عشق ہو، تو ایسا ہو"۔

"ہاں بھائی، ۔ ہم لوگوں نے تو یونہی زندگی گذاری، نہ عشق کیا نہ محبت، نہ ہجر نہ وصال، ۔ ماں باپ نے ہماری شادی کر دی، ۔ اور ہم نے کر لی، ۔ اور بیوی ایسی ملی، کہ طبیعت صاف ہو گئی۔ محض کوڑا کرکٹ"۔ اور سیٹھ نے دو تین گالیاں اپنی بیوی کو دیں، اور ساتھ ہی اپنے والدین کو۔

اتنے میں موڑ آگیا۔

"اچھا ملومل جی، جے سیتا رام"۔

"جے سیتا رام، سیٹھ جی"۔

اور اس طرح باتیں کرتے ہوئے یہ لوگ نظروں سے اوجھل ہو گئے، لیکن اس واقعے کے بعد پُشپا پر کیا گذری۔ باپ نے پشپا کو کتنی گالیاں دیں، ۔ ماں نے اپنا سر کتنی بار پیٹ لیا، اور پشپا کے دل میں صفدر کی یاد کس طرح آئی، اور اس کا کیا ردِ عمل ہوا۔ ان باتوں کو بہت کم لوگ

جانتے ہیں، لیکن اس کانفرنس کے بعد پشپا کی شادی ایک کلرک سے کر دی گئی۔ یہ کلرک لاہور میں نوکر تھا۔ جس دن وہ ڈولی میں بیٹھی اور جب ڈولی بازار میں سے گذرنے لگی، تو اُس وقت صفدر کہاں تھا۔ اُس کے دل پر گزری ہوگی، اُس کی نگاہیں کیا کہتی تھیں، اُس کے بال کیوں بکھر گئے تھے، اُس کے کھیت کیوں اُجڑ گئے تھے، ہری ہری گھاس کیوں سُوکھ گئی تھی، چشمے کا پانی کیوں نہ ٹھنڈا تھا۔ زندگی میں کیوں تلخی تھی، بانسری کی لے میں سنگیت کے نغمے کیوں نہ تھے، کیوں ایک ہیبتناک خاموشی دھان اور مکئی کے کھیتوں پر چھائی رہتی تھی۔ کیوں اُس کے سارے جسم میں ایک سُستی سی چھائی رہتی تھی، وہ کیوں خاموش اور چُپ رہتا تھا، اُس کی تہمد کیوں میلی رہتی تھی، وہ پھولوں والی قمیص کیوں نہ پہنتا تھا۔ اور جب وہ باتیں کرنے کی کوشش کرتا تھا، تو کیوں اُس کے گلے میں ایک پھندا سا لگتا تھا، وہ تو پشپا کو چاہتا تھا۔ دل و جان سے فدا تھا، وہ واقعی اُسے کھیتوں سے زیادہ پیاری تھی۔ اُس کی ساری کائنات تھی۔ آج وہی پشپا ڈولی میں بیٹھ کر اُس سے جدا ہو رہی تھی، اس خیال کے آتے ہی، اُس کے ذہن میں ایک آگ سی لگ گئی تھی۔ کن پٹیاں جلنے لگتی تھیں، اور اُس کا جی چاہتا تھا۔ کہ وہ پشپا کو ڈولی سے نکال کر لے جائے۔ لیکن وہ اکیلا تھا، پشپا اکیلی تھی، اُس کے ساتھ صرف اُس کے آنسو تھے، اُس کا غم تھا، اُس کی ناکام محبت تھی۔ اُس کے دل میں ایک بار یہ خیال آیا، کہ وہ اس ڈولی سے کود کر صفدر سے جا ملے۔

اور کہے۔" صفدر۔ مجھے اپنے حسین کھیتوں میں لے چلو۔ مجھے اپنے مرغزاروں میں لے چلو۔۔ مجھے دھان کے کھیتوں سے محبت ہے۔ مجھے اُس سوندھی سوندھی خوشبو سے محبت ہے، جو زمین سے پیدا ہوتی ہے، جو مکئی کے بھٹوں میں ہوتی ہے۔۔ جو تمھارے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔۔ جو تمھارے مضبوط بازوؤں میں ہے۔"

دل میں بغاوت کا جذبہ تھا۔۔ گو پشپا اتنی پڑھی لکھی نہ تھی، لیکن پڑھے لکھوں سے زیادہ سیانی تھی، زیادہ دانشمند تھی۔۔ کتابوں سے بہت کم سیکھا تھا۔۔ لیکن زندگی کی ایک چوٹ نے اسے مفکر بنادیا تھا، وہ سوچتی اور بار بار سوچتی اور حالات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتی۔۔ لیکن اتنی سکت نہ تھی، کہ آگے بڑھ کر اپنی خوشی دوسروں سے چھین سکے۔۔۔۔ کسی نے کہا۔" سارے خاندان کی عزت کا دارومدار تم پر ہے۔" کسی نے کہا۔" ہندو دھرم کی لاج رکھو۔" لیکن وہ سوچتی۔ کہ وہ عزت اور شرافت کیسی۔۔ جس سے اپنی خوشی چھن جائے۔۔ اور پھر بیچارے صفدر کا کیا قصور ہے، اُس نے آج تک اُسکے ساتھ کوئی بیہودگی نہ برتی تھی۔۔ کوئی بُرا مذاق نہ کیا تھا۔۔ کیا ہوا۔ کہ وہ مسلمان ہے۔۔ کیا مسلمان انسان نہیں ہوتے۔۔ کیا اُن کے دو کان، ایک ناک، اور دو آنکھیں نہیں ہوتیں۔" ٹھیک ہے۔۔ اُس کا نام صفدر ہے، اور میرا نام پشپا۔" اگر وہ کسی مسلمان کے ہاں جنم لیتی، تو اُس کا نام بیگماں ہوتا، اور اگر صفدر کسی ہندو کے ہاں جنم لیتا، تو اُس کا نام موہن ہوتا۔۔۔۔

____ جب تو اتنا فاصلہ نہ ہوتا، ____ صفدر اور پشپا کے درمیان اتنا فاصلہ کیوں ہے، کیا، فاصلہ کبھی کم نہ ہوگا؟ ____ اور اس طرح وہ ڈولی میں بیٹھی ہوئی سوچتی گئی۔

اور اسی طرح ڈولی چلی، گوجر خاں سے آگے بڑھی، جہلم آیا۔ وزیر آباد۔ گوجرانوالہ۔ اور پھر لاہور۔ اور بازاروں سے ہوتی ہوئی، کوچہ پیر شیرازی میں پہنچی،۔ اس محلے میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی،۔ اور ہندوؤں کی کم ____ لیکن دونوں قومیں آپس میں پیار و محبت سے رہتی تھیں،۔ پشپا آتے ہی اس محلے میں مشہور ہوگئی،۔ مشہور کیوں نہ ہوتی بے حد خوبصورت تھی،۔ اور محلے کے لونڈے ہمیشہ کھوج میں رہتے ہیں۔ جہاں کسی نئی لڑکی کو دیکھا، چرچا شروع کر دیا،۔ جب کبھی وہ اپنے محلے سے گذرتی تو لونڈے ایک گروپ میں کھڑے ہو کر آہستہ آہستہ باتیں کرتے،۔

ایک کہتا،۔ "بلے بلے،۔ بڑی سوہنی کڑی ہے"۔

دوسرا:۔ "نرا ٹوٹا ہی ٹوٹا"۔

تیسرا ذرا زور سے کہتا، "سوہنیو، ساڈے نال گل تے کر جاؤ"۔

"چپ کر اوئے۔ اپنے محلے دی کڑی ہے"۔ چوتھا تیسرے کو ڈانٹتا۔

"کی ہو یا پھر"۔

"شرم کیتا کرو"۔

"معاف کرنا بھئے۔ سوہن لعل دی ____"۔

"آہو یار۔ ذرا ہولے ہولے گل کرنا۔"

کوئی منچلا نوجوان چیخ کر کہتا۔ "خدا جب حُسن دیتا ہے، تو نزاکت آہی جاتی ہے"۔

ان باتوں کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا۔۔ سوہن لعل، پشپا کے لئے اچھا خاوند ثابت ہوا۔ جو کچھ وہ کما کر لاتا تھا۔ وہ اپنی بیوی کو دیتا۔ گو سوہن کی ماں اور اُس کا باپ بھی اسی گھر میں رہتے تھے۔۔ لیکن سوہن لعل کو اپنی بیوی سے بے حد محبت ہو گئی تھی۔۔ وہ اکثر بیوی کی بات کو مانتا تھا۔ پشپا اور اُس کی ساس کے درمیان اکثر لڑائی جھگڑا ہو جاتا۔ کیونکہ اُس کی ساس قدامت پرست تھی۔۔ نہ وہ انڈے کھائے نہ گوشت۔۔ چینی کے برتنوں میں ناشتہ کرنا وہ گناہِ عظیم سمجھتی تھی۔۔ رسوئی میں کسی کو جوتا لانے کی اجازت نہ تھی۔۔ دانتوں کو صاف کئے بغیر کسی کو چائے نہ مل سکتی تھی۔ کھانا وہ خود تقسیم کرتی تھی، پہلے سب کو کھلا کر۔۔۔ پھر وہ کھاتی تھی۔۔ برتنوں کو صاف کر کے، چمکا کر وہ رسوئی میں رکھتی تھی، لہسن اور پیاز کا استعمال بہت کم ہوتا تھا۔۔ لڑکیوں کو ننگے سر پھرنے کی اجازت نہ تھی۔۔ غیر مرد سے بات کرنا۔۔ ہنسی ٹھٹھا، کرنا، قہقہہ لگانا، لبوں پر لپ سٹک لگانا۔۔۔ گالوں پر پوڈر لگانا، یہ سب کچھ اس گھر میں منع تھا۔۔ سیدھی سادھی ساڑھی پہنو، آنکھیں نیچی رکھو اور دھیمے لہجے میں بات کرو۔ سات آٹھ بچے پیدا کرو اور سورگ سدھارو"۔۔۔

اور ادھر سوہن لعل اگر قدامت پسند نہ تھا، تو اُسے ترقی پسند کہنا

بھی ناواجب ہوگا،۔ اور اُسے صرف دو چیزوں سے محبت تھی، ایک کلرکی سے اور دوسرے اپنے بیوی بچوں سے،۔ انھی کے گرد اُس کی زندگی گھومتی تھی،۔ وہ بیوی کو اس لئے نہ چاہتا تھا۔ کہ وہ خوبصورت تھی،۔ بلکہ اس لئے کہ وہ اُس کی بیوی تھی، اور اُسے اپنی جنسی خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے ایک عورت چاہیئے،۔ اور اُس کی بیوی بدصورت بھی ہوتی، جب بھی وہ اُسے چاہتا، اس انہماک اور پیار سے اُس کے اردگرد گھومتا، لیکن خدا کے فضل سے بیوی خوبصورت نکلی،۔ بس پھر کیا تھا سونے پر سہاگا — ہر طرف بیوی ہی بیوی، اِدھر بیوی اُدھر بیوی، یہاں بیوی وہاں بیوی،۔

اور سوہن لعل کو ایک بات سے ضرور چڑ تھی،۔ وہ تھی چڑ مسلمانوں سے،۔ دل ہی دل میں وہ مسلمانوں سے نفرت کرتا، — اُس کے بہت کم دوست مسلمان تھے، معلوم نہیں، وہ کس طرح ایک مسلمان محلے میں آباد ہوگیا تھا،۔ وہ مسلمانوں سے بالکل اچھوتوں کی طرح سلوک کرتا،۔ گھر میں کوئی مسلمان آجائے، تو وہ ایک عجیب سی چُبھن محسوس کرتا، اور ہمیشہ اس بات کا خواہاں ہوتا۔ کہ کب یہ یہاں سے جائے گا،۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ نہ کبھی کھاتا،۔ نہ پیتا، — وہ نمستے۔ سلام۔ وغیرہ کہکر اُن سے پیچھا چُھڑاتا،۔

سوہن لعل اکثر دل میں سوچتا،۔ کہ مسلمانوں سے اُسے کیوں نفرت ہے؛ اُنھوں نے اُس کا کیا بگاڑا ہے،۔ لیکن کوئی جواب نہ پاکر وہ چُپ ہوجاتا، شاید یہ نفرت اُس کے خون میں تھی، جیسے یہ صدیوں سے چلی آرہی ہو۔

کئی سو سالوں سے ،۔ جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا شاید اُس وقت سے ،۔ اور پھر پٹھان آئے ، مغل آئے ،۔ اور یہ نفرت کی خلیج بڑھتی گئی ، وسیع ہوتی گئی ۔ کم از کم ہندوستان کی تاریخ میں اسی طرح بتایا گیا ہے ، کہ یہ نفرت وہاں سے ہی شروع ہوئی ،۔ اور جب انگریز آئے ، تو یہ نفرت اور بڑھتی گئی ، اُس کی رفتار میں اور تیزی اور تیزی آگئی ۔ خون میں اور سیاہی پھیل گئی ۔ دلوں میں اور میل آگئی ،۔ اور جب انگریز نے سرکاری عہدوں میں ہندو اور مسلمانوں کی تعداد مقرر کر دی ، تو اس نفرت میں اور اضافہ ہوتا گیا ،۔ اور سوہن لعل نے سوچا ، کہ پچھلے سال ، جب اُس کے ساتھی مسلمان کلرک کو ترقی ملی ، اور وہ پیچھے رہ گیا ، تو اس کا خون اُبل پڑا تھا ،۔ اُس دن سے اُسے مسلمانوں سے زیادہ نفرت ہو گئی تھی ،۔ لیکن وہ نفرت کا اظہار نہ کرتا ،۔ وہ دل ہی دل میں کُڑھتا رہتا ـــ سوچتا رہتا ، اور دفتر کا کام کرتا رہتا ۔

لیکن اس کے برعکس ، سوہن لعل کا باپ آزاد طبیعت تھا ۔ وہ ان باتوں کو بہت بُرا سمجھتا تھا ۔ اُس کے دوست ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی ،۔ اور خاص کر اس محلے کے حکیم صاحب ،۔ جو پانچوں وقت نماز بھی پڑھتے تھے ، اُنکے جگری دوست تھے ،۔ اُن کے گھر آنا جانا ۔ کھانا پینا ، سب کچھ جائز تھا ،۔۔ وہ اکثر سوہن لعل کو اس تنگ نظری کے لئے ڈانٹتا ۔ اُسے بُرا بھلا کہتا ۔ اور یہ بھی بتانے کی کوشش کرتا ۔ کہ ۔" سبھی مسلمان بُرے نہیں ہوتے ۔ انہیں اچھے بھی ہوتے ہیں ، اور بُرے بھی ،۔ اسی طرح ہندوؤں میں بھی بُرے آدمی ہوتے

ہیں، اور اچھے بھی، ــــ"

سوہن یہ باتیں سن لیتا،۔ اور خاموش ہو جاتا،۔ اور زندگی کی اسی تگ ودو میں سال گذرتے گئے۔ ایک سال گذرا۔ ایک بچہ پیدا ہوا۔ دوسرا گذرا۔ دوسرا بچہ پیدا ہوا ــــ اور پھر تیسرا سال شروع ہوا۔ یہ سال تو قیامت کا سال تھا،۔ وہ خلیج جو سوہن اور صفدر کے درمیان تھی،۔ وہ دن بدن بڑھتی گئی،۔ ہر جگہ جتھے بندی شروع ہوگئی، ہندو اور سکھ ایک طرف ۔ مسلمان ایک طرف ــــ مسلمان کہتا ــــ "ہم پاکستان لے کر رہیں گے۔" اور ہندو کہتا۔ "کہ ہم اکھنڈ ہندوستان بنا کر رہیں گے۔" اور سکھ کہتا، "کہ ہم پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان نہیں بننے دیں گے۔"

ایک دن حکیم صاحب، صبح سویرے تشریف لے آئے۔ اور بہت دیر تک لالہ جی سے باتیں کرتے رہے،۔ باتوں ہی باتوں میں انھوں نے بتایا،۔ کہ "مچھی ہٹے کے نوجوان بڑی تیزی سے اپنے آپ کو منظم کر رہے ہیں، کرشنا نگر، رام نگر، اور سنت نگر اور دیگر ہندو بستیاں، اپنے آپ کو ہتھیاروں سے مسلح کر رہی ہیں، سب جگہ لاٹھیاں، چھرے، پستول، تلواریں، اینٹیں، تیزاب اکٹھا کیا جا رہا ہے،۔ پشاور سے ہتھیار خریدے جا رہے ہیں، اور پٹھان بڑی بڑی قیمتوں پر پستول، اور رائفل بیچ رہے ہیں،۔ اور اسی طرح موچی دروازے کے مسلمان، اور شہر کے دیگر مسلمان مکمل تیاری کر چکے ہیں؛

سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ یہ لوگ کیوں تیار ہورہے ہیں، کونسا وہ دشمن ہے، جس کے لئے، یہ لوگ منہ پھاڑے کھڑے ہیں، کس کے خون سے یہ لوگ اپنے ہاتھ رنگنا چاہتے ہیں،۔ ارے بھائی۔ اگر تم لوگ آپس میں نہیں رہ سکتے ہو، تو الگ ہو جاؤ۔ چپکے سے پیار سے، محبت سے، الگ ہو جاؤ۔ اور الگ ہو کر امن اور چین سے رہو۔"

اور سوہن لعل کے باپ نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "حکیم جی،۔ آپ بالکل درست کہتے ہیں،۔ مجھے بھی محسوس ہو رہا ہے، کہ یہاں کچھ ہو رہا ہے، وہاں کچھ ہو رہا ہے، یہاں مسلمان اکٹھے ہو رہے ہیں، وہاں ہندو اکٹھے ہو رہے ہیں، یہاں پر ہی نہیں، سارے ہندوستان میں،۔ ایک کونے سے دوسرے کونے تک، یہ آگ سلگ رہی ہے کسی جگہ تو یہ آگ کتنوں کو خاک وسیاہ کر چکی ہے،۔ اخباروں میں آپ نے پڑھا ہوگا۔ لوگوں سے سنا ہوگا۔ کہ ہندو مسلمان کے خون کا پیاسا ہوگیا ہے، اور مسلمان ہندو کے خون کا۔ لیکن حکیم صاحب لاہور میں ایسا نہ ہوگا۔ پنجاب میں ایسی بات نہ ہوگی،۔ آخر ہم دونوں میں کیا فرق ہے،۔ ہم کیوں لڑتے ہیں، یہ درست ہے، انگریزوں نے یہ زہر پھیلایا ہے، نفرت کے انجیکشن وہ ہر بار ہمارے خون میں دیتے ہیں،۔ لیکن ہم کیوں نہیں سمجھتے،۔ ہم کیوں نہیں سوچتے،۔ حکیم صاحب،۔ یہاں کچھ نہ ہوگا۔ یہ سب معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ یہ نفرت، یہ کدورت سب دور ہو جائے گی، اور ہم بھائی بھائی بن کر رہیں گے۔"

"بٹوارہ بھی ہونے والا ہے"۔ حکیم صاحب نے دھیمی آواز میں کہا ـــ

"تو کیا ہوا۔ ہو جائے بٹوارہ ؛"۔ سوہن کے والد نے جواب دیا۔

"مجھے ڈر ہے"۔

"کس بات کا"۔

"کشت و خون ہوگا لالہ جی، ہندو مسلمان کٹ کر مر جائیں گے۔ ایک دوسرے کو نوچ نوچ کر کھا جائیں گے"۔

"تو پھر"۔

"آپ چلے جائیے یہاں سے"۔

"کہاں جائیں"۔

"ہندوستان میں"۔

"یہ بھی ہندوستان ہے!"۔

"یہ اب پاکستان بنے گا"۔

"لیکن حکیم صاحب،۔ آپ ایسی باتیں نہ کیجئے، اگر بٹوارہ ہو بھی جائے پھر بھی ہم لوگ یہاں رہیں گے،۔"

"مرنے کے لئے"۔

"کچھ کہ لو۔ حکیم صاحب،۔ یہ زمین چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔!"

"میں کب کہتا ہوں، کہ چھوڑ دو۔ لیکن وقت کا تقاضا دیکھو۔ میں سچ کہتا ہوں، میں نے ان آنکھوں سے ہزاروں بھالے دیکھے ہیں،ـــ

لاٹھیاں دیکھی ہیں، تیزاب کے بھرے ہوئے پیپے دیکھے ہیں، ۔
میں نے آنکھوں میں خون دیکھا ہے، غصہ دیکھا ہے، نفرت دیکھی
ہے، بربریت دیکھی ہے، حیوانیت دیکھی ہے،۔ میں تمھیں اپنا
بھائی سمجھ کر بتا رہا ہوں۔ کہ تم لوگ آج یہاں سے چلے جاؤ۔ بہت
ہی نازک وقت ہے اس وقت کسی پر بھروسہ کرنا اپنے آپ کو ہلاک کرنا ہے"
یہ کہکر حکیم صاحب چلے گئے، شام ہوئی سوہن لعل آیا۔ سوہن لعل نے
بتایا کہ اب لاہور میں رہنا ٹھیک نہیں،۔ بہتر یہ ہے۔ کہ بٹوارہ ہونے سے
پہلے ہم لوگ یہاں سے چلے جائیں۔
تھوڑا عرصہ بحث ہوتی رہی،۔ لیکن خوف وہراس اس شدت
سے دلوں میں سرایت کر چکا تھا۔ کہ فیصلہ کرتے وقت زیادہ دیر نہ لگی۔
طے یہ پایا۔ کہ آج شام کو اپنی ماں، بچوں اور زیورات کے ساتھ دہلی
روانہ ہو جائے۔ اور وہاں ایک مکان لے کر۔ سارا سوہن بندوبست
کرے، اور اتنے عرصے میں باقی لوگ بھی دہلی پہنچ جائیں گے:۔
اُسی رات سوہن، اور سوہن کی ماں اور سوہن کے دو بچے۔ دہلی
روانہ ہو گئے۔

۱۱ر اگست کی رات تھی،۔ سوہن جا چکا تھا۔ چارپائی پر پُشپا
سو رہی تھی اور دوسرے کمرے میں سوہن کا باپ چارپائی پر لیٹا ہوا
جاگ رہا تھا: اُس کی آنکھوں میں نیند عنقا تھی،۔ وہ سونے کی کوشش
کر رہا تھا، لیکن نیند نہ آتی تھی،۔ نیند کی جگہ آج غصہ تھا، ۔ دل میں

عجیب قسم کے خیالات آرہے تھے ۔ وہ سوچ رہا تھا ۔ کہ آج سوہن چلا گیا ، کل اُسے جانا ہوگا ، ۔ یہ گھر بار چھوڑ کر ۔ یہ زمین چھوڑ کر ۔ یہ جگہ چھوڑ کر ۔ وہ کسی دوسری جگہ نہ جانا چاہتا تھا ۔ یہاں اُس کی واقفیت تھی ، ۔ لوگ اُسے جانتے تھے ، پہچانتے تھے ، اُس کی تھوڑی بہت عزت کرتے تھے ، اور حکیم صاحب کے ساتھ اُس کا اچھا خاصا وقت کٹ جاتا تھا ، ۔ اس کے علاوہ اُسے پنجاب کی آب و ہوا پسند تھی ، ۔ یہاں کی سردی ، یہاں کی گرمی ، یہاں کی تپش ، سب کچھ بھلا لگتا تھا ، ۔ یہاں کا دودھ ، یہاں کی لسی ، یہاں کی گندم ، یہاں کا مکھن ، سب کچھ تو پسند تھا اُسے ، ۔ یہاں کی بول چال ۔ لوگوں کا اکھڑ پن ، یہاں کی مزے دار گالیاں ، یہاں کے پہلوان ، خوبصورت عورتیں ، اور مرد ، ۔ یہی چیزیں تو اُسے پسند تھیں ، ۔ وہ یہاں سے نہیں جائے گا ۔ اگر وہ کہیں اور چلا گیا ۔ تو یہ چیزیں ، اُس سے چھن جائیں گی ، ۔ اُس کی زندگی کا یہ خلا کبھی نہ بھر سکے گا ۔ اُس نے سوچا ، ۔ کہ اُس نے زندگی بھر اس قسم کی باتیں نہ سوچی تھیں ، اُس نے کبھی نہ سوچا تھا ۔ کہ اُس کا اپنا وطن اُس سے چھن جائے گا ، ۔ اُس کی دھرتی چھن جائے گی ، ۔ بھلا وہ کیوں جائے ، ۔ اور کہاں جائے ، ۔ یہاں زندگی گذاری ، ۔ یہاں ہی شادی بیاہ کیا ، بچے پیدا کئے ، نوکری کی ، پنشن لی ، ــــ اور اب نفرت کی خلیج نہ جانے اُسے کہاں لے جائے گی ، ۔ اور کس جگہ لے جائے گی ، ــــ یہی کچھ وہ سوچ رہا تھا ۔ کہ کسی نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا ۔

پشپا اپنے بستر پر کانپ گئی۔

سوہن کا باپ یکایک کھڑا ہو گیا۔

ساتھ والے کمرے سے آواز آئی ۔ "جی ۔۔۔؟۔ باہر کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے!۔"

"دیکھتا ہوں، بیٹا، تم اندر ٹھیرو،۔"

سوہن کا باپ دروازے کے قریب گیا،۔

"کون ہے؟۔"

"میں ہوں۔"

"میں کون۔"

"ارے بھائی حکیم صاحب، اور کوئی نہیں، جلدی دروازہ کھولو۔"

دروازہ کھلا۔ اور حکیم صاحب نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "ارے بھئی۔ تم لوگ ابھی تک یہیں پر ہو۔ حالات بہت ہی خراب ہو گئے ہیں چلے جاؤ یہاں سے۔ ابھی چلے جاؤ،۔"

"کہاں جائیں اس وقت؟۔"

تم نہیں جانتے،۔ حالات کتنے خراب ہو گئے ہیں،۔ شاید ابھی کچھ ہو جائے، اسی وقت،۔"

"تو پھر۔"

"کل صبح تم سب لوگ چلے جاؤ، اور آج کی رات میں یہیں ٹھیرتا ہوں،۔"

"چلیئے اندر۔"

اور وہ سب اندر چلے گئے، جونہی وہ اندر گئے تھے۔ کہ باہر بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آئیں۔

کسی نے کہا۔ "دروازہ کھول دو۔"

"اگر کوئی نہیں کھولتا، تو دروازہ توڑ دو۔"

زور سے کتنوں نے دھکا دیا۔

دروازہ ٹوٹ گیا۔

اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوا۔

لوگ اندر دوڑے۔

پشپا نے اپنے دروازے کی چٹخنی لگا دی۔

حکیم صاحب سب سے پہلے آئے۔

"آپ اس گھر کے چوکیدار ہیں۔"

حکیم صاحب چُپ تھے۔

"آگے بڑھو۔" ایک بولا۔

"ادھر مت آئیے گا۔" حکیم صاحب چلائے۔

"مارو اس کو۔" دوسرا بولا۔

"یہ تو حرامزادوں کا نمائندہ ہے۔" تیسرا چیخا۔

کسی نے حکیم صاحب کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔

اللہ اکبر کا نعرہ پھر بلند ہوا۔ اب کے آوازمیں زیادہ جوش تھا۔

لوگ پشپا کے دروازے کی طرف دوڑے، ـ سامنے سوہن کا باپ کھڑا تھا کسی نے کچھ نہیں پوچھا۔ صاف ہندو تھا۔ چھرا گھونپ دیا گیا۔

اور اس طرح سوہن کا باپ اپنے وطن ہی میں راہی ملکِ عدم ہوا۔

یہ موت کتنی بھیانک تھی، ۔ یہ قتل کتنا المناک تھا، ۔

اور پھر پشپا کی باری آئی۔ لوٹنے والوں نے اُسے بھی مالِ غنیمت سمجھا، جہاں پشپا کے گھر کی چیزیں اٹھائیں، وہاں یار لوگ پشپا کو لے بھاگے۔ عورت کی حیثیت بھی ہمارے سماج میں ایک تپائی کی سی ہے، کرسی کی سی ہے۔ یوں تو ہمارے گرنتھ صاحب میں، وید میں، قرآن مجید میں عورت کو بہت اونچا درجہ دیا جاتا ہے، لیکن موقع ملنے پر ہم لوگ سب کچھ بھول جاتے ہیں، ۔

اور اس طرح پشپا ایک کال کوٹھڑی میں بند کر دی گئی ــ وہاں پشپا کیا کرتی، اُس پر کیا گذری، ایک عورت پر کیا کچھ گذر سکتی ہے، جب وہ نہتی ہو، اکیلی ہو، ۔ اور جوان ہو، غنڈے آئے۔ اور اُس کے ساتھ سوئے، ۔ وہ خاموش رہی، ۔ اُنھوں نے اُسے قرآن کی آیتیں سکھائیں، اُسے گائے کا گوشت کھلایا، ۔ اور اُس کے ساتھ زبردستی سوتے رہے، وہ ہر روز اس بات کی خواہش کرتی، ۔ کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے، کسی نہ کسی طرح اُسے اس جہنم سے نجات ملے، ۔ لیکن وہ جاتی، تو کس طرح جاتی، ۔

ایک دن تنگ آکر اُس نے اندر سے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا ،۔ آج سوائے اُس کے گھر میں کوئی نہ تھا باہر لوگ جمع ہو گئے۔

" اللہ کے لئے دروازہ کھول دو۔ ہائے میں مر گئی ۔ پیٹ میں سخت درد ہو رہا ہے۔" پشپا چلائی ۔

" باہر تالا لگا ہوا ہے ،۔ دروازہ کس طرح کھولیں ،" لوگ چلائے۔

" کوئی بات نہیں ،۔ تالا توڑ دو ، اور اُس نے زور سی چیخ ماری ،۔ ہائے میں مر گئی ۔"

لوگوں نے رحم کھا کر تالا توڑ دیا ،۔

اندر برقعہ پہنے ہوئے ایک عورت کھڑی تھی ،۔

" کیا ہوا بہن ، ۔" ایک نے پوچھا۔

" تم گلے کی بیوی ہو ، ۔" دوسرا بولا۔

" جی ، ۔ خدا تمھارا بھلا کرے ، ۔"

" کہاں جانا چاہتی ہو ، ۔"

" کسی حکیم کے پاس ، ۔"

" کیا بیماری ہے تمھیں ؟ ۔"

" درد سے مری جا رہی ہوں ، ۔"

" جانے سے پہلے کلمہ پڑھو ، ۔"

پُشپا نے کلمہ پڑھ دیا ،۔

ہجوم نے راستہ دیدیا۔

پُشپا اُس گلی سے نکل کر ایک کھلے بازار میں آگئی۔ یہاں لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے، ایک افراتفری پھیلی ہوئی تھی، چاروں طرف مسلمان ہی مسلمان دکھائی دیتے تھے، ہندو اور سکھ بالکل عنقا تھے، وہ سوچ رہی تھی۔۔ کہ وہ کدھر جائے، وہ کس کو بلائے، وہ ہندو محلے میں کس طرح جا سکتی ہے،۔ وہ اس جہنم سے کس طرح نکل سکے گی،۔ وہ سوچتی گئی اور آگے بڑھتی گئی،۔ کچھ لوگ چیزیں اُٹھائے بھاگ رہے تھے، بہت سی دوکانیں بند تھیں،۔ کچھ دوکانیں توڑی جا رہی تھیں،۔ اور لوگ جوق در جوق چیزیں اُٹھا کر گھروں کی طرف لے جا رہے تھے،۔ دُور دھواں اور غبار پھیلا ہوا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ کسی بلڈنگ کو آگ لگ گئی ہے،۔ وہ اسی سوچ بچار میں لوگوں کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی،۔ یکایک اُس کی آنکھیں، ایک نوجوان پر لگ گئیں۔

پُشپا نے اُسے دیکھا، تو کانپ کر رہ گئی،۔

وہ اُس کی طرف بڑھا۔

پُشپا کے قدم وہیں جم گئے،۔ اور وہ زیر لب بولی — "صفدر۔"

"کون — پُشپا —" آگے بڑھنے والا آدمی بولا۔

"ش — ش — ش،۔ پشپا نہیں، بیگماں کہو بیگماں — ادھر آؤ۔"

وہ اُس کے قریب آیا،

پُشپا نے برقعہ اپنے چہرے سے اُتارا۔

"اب پہچانو۔ اور اچھی طرح پہچان لو۔"

"پُشپا۔" صفدر نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"پُشپا نہ کہو۔ بیگماں کہو۔ بیگماں ۔کسی نے پُشپا کا نام سُن لیا تو جان سے مار دے گا۔"

"تم میرے پیچھے چلی آؤ۔"

دونوں چلتے گئے۔ کافی فیصلہ طے کرنے کے بعد۔ صفدر ایک عالیشان مکان میں داخل ہوا۔

"یہ تمھارا گھر ہے،۔" پُشپا چلائی۔

"ہاں میرا گھر ہے،۔"

"تم کب سے ایسے ہوگئے،۔"

"جب سے میں نے کھیتی باڑی چھوڑی۔"

دونوں اندر چلے گئے، کوٹھی کے اندر سناٹا تھا۔

"یہ تمھارا گھر ہے،۔" پُشپا نے پھر حیران ہوکر پوچھا،۔

"پہلے کسی اور کا تھا۔ اب میرا ہے،۔ کھیتی باڑی کرکے جو کچھ کمانا تھا، وہ کما کر دیکھ لیا،۔ میں نے سوچا، لُوٹ مار کی جائے۔ اور جب ہندو مسلم فساد زوروں پر ہوا۔ تو میں بھی اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر ادھر چلا آیا۔ اور چپکے سے اس مکان پر قبضہ کرلیا،۔"

"یہاں کوئی بھی نہ تھا،۔"

"اُنھوں ہوں،۔ ایک آدمی بھی نہیں۔"

"کسی ہندو کی کوٹھی دکھائی دیتی ہے،۔"

"صاف ظاہر ہے،۔ مسلمان یہاں سے کیوں بھاگ کر جائیگا۔
اب اپنا راج ہے،۔ لو یہ ریڈیو دیکھو،۔ یہ صوفہ سٹ۔ یہ بجلی کا پنکھا۔
یہ قالین،۔ یہ ریشمی چادریں۔ یہ کرسیاں،۔ یہ کانچ کے پیالے، برتن"

"یہ سب کچھ تمھارا ہے،۔۔"

"پہلے نہیں تھا۔ اب ہے،۔"

"اور یہ حُقّہ،۔۔"

"یہ بازار سے خرید کر لایا ہوں،۔ اور اب تو سب کچھ مل گیا۔ اور
اُس نے کن انکھیوں سے پشپا کی طرف دیکھا۔

"تم نے میرے متعلق کچھ نہیں پوچھا۔" پشپا نے دبی آواز میں کہا
"اس لئے، کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ جب تم نے بُرقعہ اوڑھ
لیا،۔ تو اس کے بعد تم سے کیا پوچھوں،۔۔"

"میرے پاس بہت کچھ ہے، صفدر۔"

"یعنی،۔۔"

"میرے پاس بیگماں ہے، میرے پاس کلمہ ہے،۔ میرے
پاس گائے کا گوشت ہے، میرے پاس میری عصمت ہے۔ جو
انھوں نے لُوٹنی چاہی۔ لیکن نہ لُوٹ سکے،۔ اب تمھاری شرن
میں آئی ہوں۔"

صفدر نے یہ فقرے سُنے۔ اور پھر تند آواز میں بولا۔" مجھے
ہندوؤں سے نفرت ہے،۔ سخت نفرت ہے،۔ اب سب ہندو یہاں سے

بھاگ گئے ہیں، بہتوں کو مار ڈالا گیا ہے، زندہ جلا دیا گیا ہے، ۔ تلواروں سے تہ تیغ کر دیا گیا ہے، ۔ اب ایک ہندو بھی یہاں نہ دکھائی نہیں دیتا، ۔"

"مجھے گھر پہنچا دو، ۔۔"

"کہاں، ۔۔"

"دہلی، ۔۔"

"اب تم دہلی نہ جا سکو گی، ۔۔"

"کیوں، ۔۔"

"اس لئے ۔ کہ تم ہندو ہو، اور میں مسلمان، ۔۔ تم برقعہ پہن کر بھی مسلمان نہیں ہوئیں ۔ تم گائے کا گوشت کھا کر ہندو رہیں، ۔ تم کلمہ پڑھ کر بھی، ۔۔ اپنے دیس واپس جانا چاہتی ہو، ۔ میں تمھیں واپس نہ جانے دوں گا ۔ جانتی ہو، ۔ سکھوں نے امرتسر میں کیا کیا، ایک ایک مسلمان کو کاٹ ڈالا ۔ اُس کی بوٹی بوٹی کر ڈالی، مسلمان عورتوں کی عصمتیں لوٹ لیں، اُنھیں گھر سے بے گھر کر دیا، ۔ اُن کی گردن کاٹ کر، اُن کے لہو سے ہی 'پاکستان مردہ باد' لکھا، ۔ ننگی عورتوں کا جلوس نکالا ۔۔ اُنھیں دھکے دے کر اُن کے منھ پر تھوکا، ہزاروں مسلمان عورتوں کو اپنے گھروں میں رکھ لیا، ۔ رہتک میں جاٹوں نے مسلمانوں کو سُور کا گوشت کھلایا، ۔ اور لاٹھیوں سے اُن کا سر پھوڑ دیا، ۔ اور اب سارا مشرقی پنجاب مسلمانوں سے خالی ہے، ۔ قادیان مسلمانوں سے خالی ہے، گورداسپور

مسلمانوں سے خالی ہے۔ جہاں بھی مسلمان نظر آتا تھا، وہ کاٹ دیا جاتا ہے۔ — مجھے ہر ہندو سے نفرت ہے۔ سخت نفرت ہے۔

"گوجرخاں میں کیا کچھ ہوا۔"

"کچھ نہیں۔ وہاں ہو بھی کیا سکتا تھا۔ کچھ ہندو تو پہلے بھاگ گئے تھے، باقی جو بچے — اُن کو مار دیا گیا ہے۔" صفدر نے جواب دیا۔ "چھوٹے بچوں کو کنوؤں میں پھینک دیا۔ جوان عورتوں کو گھروں میں رکھ لیا، اور بوڑھی عورتوں کو فاقوں سے مار دیا۔ اور اب سارے شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہے۔"

"تم خوش ہو ان باتوں سے" پشپا نے بڑی انکساری سے یہ سوال کیا۔

"جو کچھ لوگ کرتے ہیں، وہی کچھ میں کرتا ہوں۔ — تمہاری ذات کے لوگوں نے مسلمانوں نے کم ظلم نہیں ڈھائے۔ ہم بھی تمہاری ذات کے لوگوں پر ظلم کرتے ہیں۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔"

"تمہاری بیوی کہاں ہے؟ —"

وہ خاموش رہا۔

"بولتے کیوں نہیں۔ — کیا تم نے شادی کی ہے؟"

"آج کروں گا۔ —"

"کس سے۔ —"

"تم سے۔ —"

یہ لفظ سُن کر پُشپا کا کلیجہ دہل گیا۔
"کیا یہ وہی صفدر ہے، اُس کے بچپن کا ساتھی"۔ اُس نے سوچا۔
"جانتی ہو۔۔ جانتی ہو۔۔" صفدر کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔۔ "جب تمھاری ڈولی بازار سے گذر رہی تھی، تو میرے دل پر کیا گذر رہی تھی، میرے دل کی کیا حالت تھی،۔ اور میں نے آج تک شادی کیوں نہ کی،۔ یہ بھی جانتی ہو۔ اُس وقت جی چاہتا تھا کہ اِس ڈولی کو آگ لگا دوں۔ تمھارے والد کو جان سے مار دُوں۔ تمھارے رشتہ داروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دُوں،۔ بے وقوف، جاہل تھے، تمھارے والدین، تمھارے رشتہ دار،۔ اچھا ہوا۔ یہ سب لوگ مر گئے۔ تباہ ہوئے،۔ برباد ہوئے،۔۔"
"میں بھی اُس دن روئی تھی۔"
"جھوٹ،۔ بالکل جھوٹ۔" صفدر نے زمین پر پاؤں مارتے ہوئے کہا،۔۔ "تم سانپ کی اولاد ہو،۔ تم پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔" اور وہ کمرے میں گھومنے لگا،۔۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ وہ اپنے ہاتھوں کو زور سے ملتا رہا،۔ ایک دو بار اُس نے دانتوں سے اپنے ہونٹوں کو کاٹ لیا،۔ اُس کی آنکھیں شعلہ بار ہو رہی تھیں،۔ اُس کی رفتار میں تیزی آگئی تھی،۔۔
"صفدر" پُشپا چلائی۔
صفدر کھڑا ہو گیا،۔ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، اُس کا سارا

جسم کانپ رہا تھا،۔ اُس کے ماتھے پر پسینہ آرہا تھا،۔ اور اُس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی،۔

"صفدر۔ میرا خاوند ابھی تک زندہ ہے"۔

"میرے دو بچے ابھی تک زندہ ہیں۔"

"تمھیں میری محبت کی قسم۔ اگر تم —"

"جھوٹ نہ بولو۔" صفدر چلایا،۔

"میری آنکھوں میں آنسو تھے، جب میں گوجر خاں سے چلی تھی،۔

"جھوٹ۔ محض فریب،۔"

"اگر اب بھی تمھیں یقین نہیں آتا۔ تو تمھارے جی میں آئے کرلو،۔ پشپا نے ہار کر کہا۔

صفدر ٹکٹکی لگا کر پشپا کی طرف دیکھنے لگا۔ نہ جانے وہ کیا دیکھ رہا تھا۔ اور کیا سوچ رہا تھا۔ اور کیا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ چند لمحوں کے لئے خاموش، چُپ چاپ کھڑا رہا۔ پشپا کی طرف نگاہ کئے ہوئے۔ جیسے اُس کی آنکھیں پتھرا گئی ہوں — اور پھر وہ چپکے سے دوسرے دروازے کی طرف بڑھا— اور ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔

پشپا نے اپنے دروازے کی چٹخنی بند کرلی،۔

صفدر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔

اور پشپا اپنی چارپائی پر لیٹ کر یہ سوچ رہی تھی،۔ کہ آج کیا ہوگا کیا سب مسلمان ایسے ہوتے ہیں،۔ نہیں — کبھی نہیں،۔—

حکیم صاحب ایسے نہ تھے، بچارے مارے گئے۔ صفدر بھی مسلمان ہے،
اُسکے بچپن کا ساتھی،۔ کسان کا بیٹا،۔ وہ ایسا نہیں کریگا۔"
اُسے یقین تھا۔ اگر اب اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا، تو وہ شور مچائیگی
لیکن یہاں تو کوئی بھی نہیں،۔ شور مچانے سے کیا فائدہ ۔۔۔
وہ سوچتی رہی، اور وقت گذرتا گیا۔
دس ۔ گیارہ ۔ بارہ ۔۔۔
گھڑیال نے ایک بجایا۔
صفدر نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور آواز آئی۔ "پُشپا۔ پُشپا۔"
نام سُنکر پُشپا کا دل حلق میں اُتر آیا۔
"پُشپا مت کہو۔ بیگماں کہو۔ بیگماں۔" اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔
پُشپا کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔
اب کیا ہوگا۔ اب کیا ہوگا؟ اُس نے سوچا۔
"کیا بات ہے، صفدر،۔ پُشپا نے اُسی انداز میں بلایا،۔ جیسے وہ گوجر خاں
میں کنویں کے قریب اُسے بُلایا کرتی تھی۔
"دیکھ۔ تیری چارپائی کے قریب ایک بڑی الماری ہے! اُسے کھولکر
اُسمیں سے کچھ نکال لے، اور کھا۔ روٹیاں بھی ہونگی۔ اور سالن بھی،۔ دیکھ
ضرور کھالے،۔ میں نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔ میں کتنا بیوقوف ہوں۔" اور
یہ کہکر وہ چارپائی پر لیٹ گیا۔
پُشپا نے یہ سُنتے ہی اپنے دونوں ہاتھ دعا کیلئے آسمان کی طرف بڑھا دیئے

جیسے نیکی کا دیوتا یکایک اس کرۂ ارض پر اُترا ہو، ۔ جیسے طوفان یکایک تھم گیا ہو، ۔ وہ اسوقت خوش تھی، یہ جان کر۔ کہ سب مسلمان بُرے نہیں ہوتے اُن میں اچھے بھی ہوتے ہیں، اور بُرے بھی، ۔ جیسے اچھے ہندو بھی ہوتے ہیں، اور بُرے بھی، ۔ بہت دنوں کے بعد، آج پُشپا کے دل میں خوشی نے جھانک کر دیکھا تھا، ۔ اور وہ سوچنے لگی، صفدر واقعی انسان ہے۔ وہ واقعی اچھا ہے، بہت ہی اچھا، ۔ اور وہ سونے کی کوشش کرنے لگی، ۔ آج وہ پہلی بار آرام چین سے سوئیگی ۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی صفدر نے پُشپا کو شرنارتھیوں کی ٹرین میں پہنچا دیا، ۔ پلیٹ فارم پر پہنچانے سے پہلے اُس نے جی بھر کر پُشپا کو دیکھا، وہ نگاہ جسمیں ہر لمحہ یہ کشمکش رہتی تھی، ۔ اسے واپس لے چلو، ۔ اسے واپس لے چلو۔ پُشپا تمھاری ہے، پُشپا تمھاری ہے، ۔ لیکن صفدر نے اس خیال کو ذہن کے ایک کونے میں مُقیّد رکھا، ۔ اُسے اپنے دل و دماغ پر حاوی نہ ہونے دیا، ۔ رات بھر وہ نہ سویا تھا، ۔ اس کشمکش میں نہ نیند آئی تھی، ۔ نہ چین ملا تھا، ۔ نہ سکون ملا تھا، ۔ بدی نے ہر بار اُسے پُشپا کو اپنے قبضے میں رکھنے کیلئے کہا، لیکن آخر کار نیکی اور سچائی کی فتح ہوئی، ۔ اگر پُشپا ایکبار بھی اس بات کا اظہار کرتی، ۔ اسکی آنکھوں میں ایکبار بھی اس بات کا اظہار ہوتا، ۔ ایکبار پہلے پیار کی جھلک دکھائی دیتی، ۔ تو وہ اُسے کبھی نہ جانے دیتا، ۔ وہ اُسے زبردستی اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا، ۔ وہ جانا چاہتی ہے ۔ تو چلی جائے، ۔ ایکبار پہلے بھی وہ چلی گئی تھی، اور وہ چُپ چاپ

کھڑا تھا، خاموش کھڑا رہا تھا۔، اور پُشپا اُسکے قریب سے گذر کر دوسرے شہر میں چلی گئی تھی۔، اُسوقت شاید اُسے اُمید تھی۔، کہ کم از کم وہ اُسکی صورت دیکھ سکیگا لیکن اب تو حالات مختلف ہو گئے ہیں،۔ پُشپا اُس سے ہمیشہ کیلئے جُدا ہو رہی تھی۔، اب وہ اُسے کبھی نہ دیکھ سکے گا۔ اب وہ ایک دوسرے ملک میں جا رہی ہے۔ جہاں وہ کبھی نہ جا سکیگا۔ اس سے پہلے وہ کئی بار امرتسر گیا تھا۔ لیکن اب نہ جا سکیگا: گورداسپور نہ جا سکیگا۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ کسطرح ہوا۔ اور ایکدن میں ہو گیا! اب اُدھر سب غیر بستے ہیں،۔ دشمن کا ملک ہے۔۔ اور وہ یہ سوچ رہا تھا۔ کہ گاڑی چلی گئی،۔ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی،۔ اُسکی آنکھوں میں سے آنسو نکل آئے۔ اُسکے رخساروں پر ڈھلکے،۔ اُس نے سوچا،۔ یہ کیسا قانون ہے، یہ کیسی سماج ہے،۔ یہ کیسی گورنمنٹ ہے جو اپنوں کو بھی غیر بنا دیتی ہے،۔۔ اُس نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے، اور اپنے گھر کی طرف رُخ کیا،۔۔

جس ڈبے میں پُشپا بیٹھی ہوئی تھی،۔ وہ ڈبہ پناہ گزینوں سے اٹا ہوا تھا،۔ سب کے چہروں پر حیرانی چھائی ہوئی تھی، ان میں بچے بھی تھے، جوان بھی تھے، بوڑھے بھی تھے، عورتیں بھی تھیں،۔ گو ملٹری ٹرین کے ساتھ تھی، لیکن جبتک ہندوستان کی حد نہیں آجاتی۔ اُنھیں سکون نصیب نہیں ہوگا۔ جوں جوں گاڑی تیزی سے بھاگتی جاتی تھی،۔ موت کے مہیب سائے پیچھے رہتے جاتے تھے،۔ زندگی کی آس بڑھتی جاتی تھی،۔ ہاں۔ ہاں۔ اب اپنی دھرتی آئیگی۔ وہ دھرتی جسکو وہ چھوڑ کر آئے ہیں،۔ وہ اب پرائی ہو گئی،۔۔ وہ یادیں، جو اُس دھرتی کے ساتھ وابستہ تھیں وہ زندگی جو لوگ وہاں بسر کر کے آئے تھے، اُسکی یاد اُنھیں ذہن سے نوچ نوچ کر

پھینکدینا پڑیگی،۔ اب اپنی دھرتی آئیگی،۔ اپنا دیش آئیگا۔ اس سے پہلے لوگ امرتسر آچکے تھے، لیکن اُنھیں اتنی خوشی کبھی نہ ہوئی تھی، آج کیوں سب لوگ امرتسر کا نام پڑھنے کیلئے بیتاب ہیں،۔ امرتسر کا نام وہ ہزار ہا بار پڑھ چکے تھے لیکن آج۔ اسوقت اس نام میں اتنی کشش تھی، اتنی مقناطیسی قوت تھی، جسکا کہ وہ اندازہ نہیں کر سکتے ہاں۔ ہاں۔ اپنا شہر،۔ اپنا ملک،۔ اپنی زندگی،۔۔۔ درا‌صل ان سب کے پیچھے ایک اور جذبہ کارفرما تھا،۔ وہ جذبہ تھا۔ موت سے بچنے کا۔ زندہ رہنے کا۔ یہ وہ جذبہ تھا جس نے اُنھیں، اپنے گھروں سے باہر نکالا، جس نے اُنھیں بیسیوں میل پیدل چلایا، پاؤں سے ننگے، پیٹ سے بھوکے،۔ بچّوں کو کندھوں پر لاد کر۔ سینکڑوں ہزاروں لاکھوں روپوں کا مال چھوڑ کر، اپنے کھیتوں، مکانوں کو چھوڑ کر، زندگی کو اپنے سینے میں دبائے وہ ادھر آنکلے تھے،۔۔۔ اور اب امرتسر آچکا تھا۔ لوگوں کے چہرے پر خوشی اور انبساط کی لہریں دوڑ گئیں،۔ اُنکی خوشی، بالکل اُس بیکار نوجوان کی سی تھی، جسے یکایک نوکری مل جائے،۔ اب ڈبے میں زندگی آگئی تھی، بچّے رو رہے تھے اور نوجوانوں کے سوکھے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آگئی تھی،۔۔۔ یہ گاڑیاں جو پاکستان سے ہندوستان کی طرف آتی تھیں، اور جو ہندوستان سے پاکستان کی طرف جاتی تھیں، ان سب میں ہزاروں ہندو اور مسلمان، اپنی جانوں کو بچائے، اپنے اپنے وطن کی طرف تیزی سے بھاگے جا رہے تھے،۔۔۔ اور پُشپا نے سوچا۔ اب کوئی بات نہیں،۔ اب اپنا شہر بھی آجائیگا۔ اب کسی بات کی فکر نہیں،۔ اب تو اپنا وطن ہے اب یہاں کوئی غیر نہیں،۔ گاڑی آگے بڑھتی جائیگی،۔ اور وہ جلد ہی دہلی پہنچ جائیگی اور شرنارتھیوں کے کیمپ سے اپنے خاوند کا پتہ لگا کر، وہ اپنے گھر پہنچ جائیگی۔۔ وہاں

اُسکے بچے ہونگے۔ مانو اور لالی،۔ اور اُسکا خاوند،۔ اور اُسکی ساس،۔ وہ اپنی ساس سے کبھی نہ جھگڑیگی،۔ کیا ہوا۔ کہ اُسکی ساس اُس سے بات بات پر جھگڑتی تھی! اب وہ چُپ رہیگی، خاموش رہیگی،۔ جو کچھ اُسپر گذری ہے، اُس سے زیادہ ظلم اُسپر کبھی نہیں ہو سکتا،۔ اور ساس تو صرف طعنے دیتی تھی کبھی کبھار گالی دیدی،۔ اس سے زیادہ اُس نے کبھی کچھ نہیں کیا۔ زندگی میں پہلی بار پُشپا کے دل میں ساس کیلیئے محبت کا جذبہ بیدار ہوا۔۔ اُسکا مانو کیسا ہوگا۔ اور اُسکا لالی،۔ دونوں اُسکے لئے روتے ہونگے، بچارے ماں کی یاد میں سُوکھ کر کانٹا ہو گئے ہونگے،۔ اور سوہن،۔ وہ تو۔ وہ تو۔۔ پُشپا اُنکا خیال آتے ہی شرما گئی،۔۔ اور ہاں، اُسے خیال آیا۔ کہ وہ ماضی کو بالکل بھول جائیگی،۔۔ اپنے وطن میں آکر اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ کہ اُس نے دوبارہ جنم لیا ہے،۔ وہ پہلی پُشپا مر چکی تھی،۔ اُسکی یادیں مر چکی تھیں،۔ اگر کچھ یاد تھا۔ تو صفدر کی نیکی،۔۔ اگر وہ اُسے اپنے گھر نہ لاتا،۔ تو وہ اُنہی کال کوٹھری میں اسی مکروہ زندگی کو بسر کرتے ہوئے مر جاتی،۔ صفدر ایک مینار کی طرح ان حدوں کے درمیان کھڑا تھا۔ وہ حد،۔۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان شروع ہوتی ہے،۔۔ بچارا صفدر اکیلا تھا۔۔

اور یہ سوچتے سوچتے وہ سونے لگی۔ اور سوتے سوتے، سوچنے لگی،۔۔ اور وقت گذرتا گیا۔ اور ٹرین آگے بڑھتی گئی،۔ اور پھر وہ دہلی آپہنچی،۔

وہ ٹرین سے اُتری، تو والنٹیروں نے اُسے آگھیرا۔ "ماتا کہاں جاؤگی" "بی بی۔ تمھارے خاوند کا کیا نام ہے،۔ ایک دو والنٹیروں نے اُسے ایک تانگہ میں بٹھایا،۔ اور تانگہ شرنارتھیوں کے کیمپ کی طرف روانہ ہوا،۔۔ واقعی یہ اچھا

دیش ہے، سبھی اپنے دکھائی دیتے ہیں،۔ یہاں نہ نفرت ہے، نہ موت کا ڈر۔ واقعی یہ گاندھی ملک ہے، جواہر کا دیش ہے، یہاں تو انصاف ہوتا ہے،۔ یہاں لوگ آپس میں نہیں لڑتے، کوئی کسی کا خون نہیں کرتا، یہاں عورتوں پر ظلم نہیں ہوتا،۔ بچوں کو کوئی نہیں مارتا،۔۔ اب تو وہ اپنے گھر جائیگی، اپنے خاوند کے پاس جائیگی،۔ اپنے بچوں کے ساتھ رہیگی،۔ وہ اپنی ساس کو بُرا نہ سمجھے گی، اُسکے پاؤں پر سر رکھ کر اپنے گناہوں کی معافی مانگیگی،۔ اپنے بچوں کو سینے سے لگائیگی،۔ ہاں۔ہاں۔ وہ اُن سب کو بتادیگی، کہ اس عرصے میں اُسپر کیا کچھ گذری۔ کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، جہنم کی کن، کن وادیوں سے گذرنا پڑا۔ کالے مہیب سایوں نے اُسکے جسم پر کیا کیا ظلم کیئے، سوچتے سوچتے وہ رونے لگی،۔ اُس نے اپنی پھٹی ہوئی چُنی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے،۔۔۔

والنٹیر نے عورت کو روتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "رومت بہن۔ تمہارے آنسوؤں کا ہم نے بدلہ لے لیا ہے، مسلمانوں کی وہ حالت کی ہے، کہ وہ عمر بھر یاد کریں گے! (والنٹیر کو اور غصہ آگیا) ہم نے بھی کم نہیں کیا۔ ایک ایک ہندو عورت اور ہندو بچے کا ہم نے بدلہ لیا ہے، مسلمان عورتوں کو ننگا کر کے بازاروں سے لیجایا گیا ہے، بچوں کو زندہ جلایا گیا ہے،۔۔ اُنکی داڑھیوں پر ہاتھ صاف کیا ہے،۔ اُنھیں سُور کا گوشت کھلایا ہے،۔ بوڑھوں اور جوانوں کو چھروں کا نشانہ بنایا ہے، اُنکی مسجدوں پر قبضہ کیا ہے، اُنھیں مکانوں سے نکالدیا ہے، اُنکے منھ پر تھوکا ہے ۔۔ مائی! جسطرح مسلمانوں نے ہندوؤں پر ظلم کیئے ہیں، اُسی طرح ہم لوگوں نے مسلمانوں سے اس شہر میں بدلہ لیا ہے ۔۔ رومت بہن۔"

والنٹیر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔"اب اپنے وطن میں آگئی ہو
یہ ہمارا اور تمھارا ملک ہے، یہاں مسلمان کا بچہ پنپ نہیں سکتا۔ یہ دیس صرف
ہندوؤں کا ہے، صرف چوٹی والوں کا۔ صرف بھارت ماتا کے فرزندوں کا۔
یہاں صرف ہر ہر مہادیو کا نعرہ بلند ہو سکتا ہے۔ یہ خالص آریوں کا دیش ہے،
ہٹلر نے یہودیوں کو جرمنی سے نکالدیا تھا۔ اسی طرح مسلمانوں کو ہندوستان سے
نکالدیا جائیگا۔ سمجھیں، چُپ کر میری بہن۔" وہ چُپ رہی، خاموش رہی، تانگہ
چلتا رہا۔ اور راستے بھر کی خاک اُن پر پڑتی رہی۔ اتنے میں کیمپ آگیا۔

وہ صرف دو دن کیمپ میں ٹھیری۔ یہاں ٹھیرنا بھی آسان نہ تھا۔
آدمیوں کا کیمپ نہ تھا۔ بالکل دیوانوں کا کیمپ تھا، لوگ ہراساں تھے،
پریشان تھے، غصّے سے آگ بگولہ ہو رہے تھے، مسلمانوں کو گالیاں دے رہے
تھے، سرکاری حکومت کو ملیامیٹ کرنا چاہتے تھے، سرکاری حکومت اُنکا اچھی
طرح خیال نہ کرتی تھی، کسی کا خاوند مارا گیا تھا، تو کسی کا لڑکا، کسی کی جوان لڑکی
پاکستان میں رہ گئی تھی، تو کسی کا چھوٹا بچّہ گھر میں رہ گیا تھا۔ ایک عورت تو بالکل
پاگل ہو گئی تھی، اُسے صرف اپنے کپڑوں اور گہنوں کا دھیان تھا۔ وہ ہر بار
یہی چلّاتی۔"ہائے میرے کپڑے۔ ہائے میرے زیور۔" کسی کے انگ پر وہ
زیور دیکھ لیتی، تو دوڑ کر اُسے چمٹ جاتی۔"یہی میرے گہنے ہیں، تم چور ہو
تم مسلمان ہو۔" اور پھر بال نوچتی ہوئی، چیخیں مارتی ہوئی وہ آگے نکل گئی۔
دوسرے دن کیمپ والوں نے اُسے پاگل خانے بھیجدیا۔ سارے کیمپ میں
مسلمانوں کے خلاف سخت نفرت تھی، یہ لوگ صرف یہی چاہتے تھے کہ تمام

مسلمانوں کا ملیامیٹ کر دیا جائے ۔۔ اُنکے سینے میں ایک نہ بُجھنے والی آگ نے جنم لیا تھا ۔۔ اس آگ کو بُجھانے کا صرف یہی طریقہ تھا ۔ کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا خاتمہ کر دیا جائے ۔ پُشپا اس ماحول میں نہ رہ سکتی تھی ۔۔ اُس نے ایک دو دن میں بہت دوڑ دھوپ کی ۔۔ اور اپنے خاوند کا پتہ لگا ہی لیا ۔ اُس کا خاوند سبزی منڈی میں رہتا تھا ۔۔

وہ صرف دو دن اس کیمپ میں ٹھیری ۔

تیسرے دن اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی ۔۔ ایک والنٹیر اُسکے ساتھ تھا ۔ سبزی منڈی آگئی تھی ۔۔ وہ گھر بھی قریب تھا ۔ وہ گھر اب نظر آرہا تھا ۔ گھر سے تھوڑے فاصلے پر والنٹیر نے کہا ۔ "بہن یہی گھر ہے ، اب تو تم جا سکتی ہو ۔"

پُشپا نے سر ہلایا ۔ اور والنٹیر واپس چلا گیا ۔

اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا ۔ دروازہ کھُلا ۔

سامنے اُس کی ساس کھڑی تھی ۔۔

وہ اُس کے پاؤں پر گر گئی ۔

ساس نے اُسے اُٹھایا اور گلے سے لگایا ، دونوں رونے لگیں ۔

"اور وہ ۔۔" ساس نے کراہتے ہوئے پوچھا ۔

"وہ مارے گئے" پُشپا نے گلوگیر آواز میں کہا ۔

اُس کی ساس چیخ مار کر گر پڑی ۔

پُشپا نے ساس کو اُٹھایا ۔۔ اور اندر لے گئی ، اندر کمرے میں اُس کے بچے کھیل رہے تھے ۔۔ دونوں اُسکے سینے کے ساتھ چمٹ گئے ۔۔ اسوقت ،

پُشپا اپنے سارے رنج و غم اپنے سارے دُکھ بھول گئی تھی،۔ اُس نے بڑے پیار اور شفقت سے دونوں کو چوما،۔ اُنکے بالوں پر ہاتھ پھیرا،۔ اُنکی آنکھوں کو دیکھا،۔ اُنکے جسم پر ہاتھ پھیرا،۔ اور پھر سینے سے چمٹا لیا،۔ منو اور لالی، یہ دونوں میرے ہیں، دنیا کی کوئی طاقت انھیں مجھ سے جدا نہیں کر سکتی،۔ ہاں یہی میرے بچے ہیں،۔ اُس نے سوچا،۔ اُس کی ساس رو دھو کر اب چُپ ہو گئی تھی،۔ تھوڑی بہت ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں،۔ ساس نے پُشپا کو کھانا دیا،۔ اور پُشپا کھانا کھا کر سو گئی،۔

شام ہوئی،۔ اور سوہن گھر آیا،۔ پُشپا کو دیکھ کر اُسکی آنکھوں میں چمک عود کر آئی،۔ اپنی ماں کے سامنے وہ کچھ نہ کہہ سکا،۔ رات کھانا کھا کر جب وہ دونوں اکٹھے بیٹھے، تو پُشپا نے ساری واردات سُنا ڈالی، پُشپا نے الف سے لیکر ے تک سب کچھ سُنا دیا،۔ اُس نے یہ باتیں اسطرح کہیں۔ جیسے وہ ان باتوں کو ہمیشہ کیلئے بھول جانا چاہتی ہے،۔ سوہن ہر بات نظر انداز کر سکتا تھا، لیکن جب پُشپا نے یہ بات بتائی، کہ مسلمان اُسکے ساتھ سوئے، اُنھوں نے زبردستی اُسکے ساتھ ہمبستری کی،۔ تو اُسکا خون اُبل اُٹھا،۔ نفرت اور حقارت کا جذبہ اُسکے خون میں لہریں مارنے لگا،۔

اُسوقت تو سوہن خاموش رہا،۔

صبح ہوتے ہی اُس نے اپنی ماں سے باتیں کیں،۔ دونوں ماں اور بیٹا، دیر تک باتیں کرتے رہے، اور وہ اپنے بچوں کی پیار اور الفت کی باتیں کرتی رہی

اُنھیں چومتی رہی، چاٹتی رہی، ۔ دن چڑھتے ہی اُسکی ساس نے اپنا رُوپ دھارا۔ پُشپا کو الگ برتن دیئے گئے۔ ایک انگیٹھی دی گئی۔ اور اُسکا الگ راشن دیا گیا۔ آج سے اُسکا کھانا الگ پکا کریگا، وہ ساس کی رسوئی میں آسکتی تھی، اُسکے برتنوں کو ہاتھ نہ لگا سکتی تھی، ۔ اور وہ صرف ایک اچھوت بنکر اس گھر میں رہ سکتی تھی، ۔

پُشپا نے ایک دن کاٹا۔

اُسکے خاوند نے پُشپا سے بات کرنے سے انکار کر دیا، اور یہاں تک ہدایت کر دی گئی۔ کہ وہ اُسکے بچّوں کو ہاتھ نہ لگائے، ۔

دوسرا دن بیت گیا۔

تیسرے دن اُسکے خاوند نے اُسے صاف صاف کہدیا، کہ وہ اُسے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا، ۔ اُسکا ضمیر اُسے اِس بات کی اجازت نہیں دیتا، کہ وہ پُشپا کے ساتھ ایک خاوند کا رشتہ قائم رکھ سکے، ۔ اب یہ رشتہ اُسکے ضمیر اور تہذیب دونوں کے خلاف ہے، ۔

پُشپا یہ سُنکر حیران و ششدر رہ گئی، نبض کی رفتار سُست پڑ گئی تھی، اور چہرے پر مُردنی چھا گئی تھی، ۔ اُسے یقین نہ آتا تھا۔ کہ سوہن، اُسکا خاوند اتنا پتھر دِل ہو سکتا تھا، ۔

سوہن کے دوٹوک جواب میں کتنی بہمیت تھی، شقاوت تھی، بربریت تھی، اُس کا مذہب کتنا اندھا تھا۔ وہ خود کتنا جاہل تھا، اور بیوقوف تھا،

اسوقت پُشپا کرتی ۔۔ توکیا کر سکتی تھی، ۔ وہ جاتی، تو کہاں جا سکتی تھی، ۔

نہ وہ ہندوستان میں رہ سکتی تھی،! ورنہ وہ پاکستان میں رہ سکتی تھی۔، نہ ہندوؤں کی بیٹی تھی، نہ مسلمانوں کی۔ لیکن وہ اس گھر میں نہ رہ سکتی تھی۔۔ نفرت کا ایک طوفان اُسکے ذہن میں اُمڈ آیا، وہ اب کہاں جائے، کدھر جائے، کسکا سہارا لے۔۔ یہ عجیب قسم کا انصاف تھا۔۔ وہ سوچتی ہوئی اچانک گھر سے باہر نکل آئی۔، شام ہو چکی تھی۔۔ اور وہ آہستہ آہستہ سڑک پر قدم اُٹھائے جا رہی تھی۔، کچھ عرصہ وہ یونہی چلتی گئی۔۔ جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہو۔ سڑک کے قریب املی کا درخت تھا۔۔ وہ اُسکا سہارا لیکر بیٹھ گئی۔، اب چاروں طرف اندھیرا تھا۔ اور وہ تھک گئی تھی، جب سے اُسکا خاوند لاہور سے گیا تھا وہ جاگ رہی تھی۔، اُسکے جسم کی ہر نس جاگ رہی تھی۔، اُسکا ذہن جاگ رہا تھا، لیکن اب چاروں طرف اندھیرا تھا۔۔ وہ اب کیا کرے۔، پاکستان سے وہ آچکی ہے۔۔ اور اسوقت وہ ہندوستان کے دار الخلافہ میں بیٹھی ہوئی تھی اکیلی، لاچار۔ بے یار و مددگار۔ — گو وہ جسمانی طور پر تھکی ہوئی تھی، لیکن یہ سفر جو اُس نے گوجر خاں سے لیکر دہلی تک کیا تھا کتنا المناک سفر تھا۔ یہ سفر جو پاکستان سے شروع ہوا۔ اور ہندوستان میں ختم ہوا کتنا خون سے لتھڑا ہوا تھا۔، اسکے ہر موڑ پر ہزاروں۔ لاکھوں انسانوں کی قبریں بنی ہوئی تھیں۔۔ اور دن بدن۔ روز بروز۔ یہ سڑک انسانوں کے خون سے سُرخ ہوتی جا رہی تھی۔، اس سفر میں اُس نے پاکستان کی عظمت دیکھی۔، اور پاکستان کی گراوٹ دیکھی ہے۔ اور اب وہ ہندوستان کی عظمت اور گراوٹ سے دو چار ہو رہی تھی۔، اُسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ کہ اُس نے کیوں سفر شروع کیا۔ کسی محبت کے زیر اثر وہ یہاں آپہنچی۔۔ اور پھر یہ سلوک اپنے ہی خاوند کے ہاتھوں — یہ کس قسم کا ملک ہے، یہ کس قسم کی تہذیب ہے، یہ کیسا تمدن ہے کیا اسی لئے ہندوستان کا بٹوارہ ہوا تھا۔، کیا اسی لئے پنجاب کے دو ٹکڑے ہوئے تھے۔

آج اُسکا ذہن نہ جانے، کیوں اتنا بیدار ہو گیا تھا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی، وہ نہایت شدت سے سوچ رہی تھی۔ اور اسوقت وہ اُس مقام پر کھڑی تھی، جہاں انسان پاگل ہو سکتا ہے، یا ایک نئی راہ اختیار کر سکتا ہے،۔ جب اپنے چاہنے والے، جب اپنی زندگی کے ساتھ پرائے بن جائیں، تو زندگی کی قدریں بدل جاتی ہیں، ہم پُشپا نے اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالی، اب اندھیرا زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ اور مکانوں میں قمقمے روشن تھے،۔ وہاں زندگی کی نشانی تھی، لیکن یہ کیسی زندگی تھی،۔ اُسے اسوقت صرف اپنے خاوند پر غصہ آرہا تھا جس نے اُسے گھر سے نکل جانیکا حکم دیدیا تھا۔ بھلا اس سارے جھگڑے میں اُسکا کیا قصور تھا اگر غنڈوں نے اُسے اغوا کیا۔ تو اسمیں اُسکا کیا قصور،۔ اگر وہ لوگ زبردستی اُسکے ساتھ سوئے تو وہ کیا کر سکتی تھی،۔ اس خیال کے آتے ہی اُسکے ذہن میں چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں! جیسے ابھی اُسے کچھ ہو جائیگا۔ ابھی وہ پاگل ہو جائیگی! ابھی اُسکا ذہن ناکارہ ہو جائے گا، ابھی اُسکا بھیجا، کھوپری سے باہر اُبل پڑیگا، اُس نے آکاش کی طرف نگاہ کی،۔ ستارے اُسکی پاکبازی اور ایثار کے قائل تھے،۔ چاند اُسکی روح کی پاکیزگی اور اُسکی روح کے خلوص سے پوری طرح آگاہ تھا،۔ اُس نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔" میں بالکل سچی ہوں، میں تمھاری قسم کھا کر کہتی ہوں،۔ کہ میری روح ابھی تک پاک اور مقدس ہے،۔ میرے جسم سے لوگوں نے زنا کیا ہو گا، لیکن میری روح اُس فعل سے بالکل الگ تھلگ تھی، وہ میرے ساتھ نہیں سوئے تھے،۔ بلکہ ایک بے جان، مُردہ جسم کیساتھ سوئے تھے،" اور آج اُس کی روح میں ایک طوفان آچکا تھا، اور وہ ننگی ہو کر سب کے سامنے یہ کہنا چاہتی تھی کہ

"اے دو مملکتوں پر حکومت کرنے والو۔ اے عزت اور عفت کے متوالو، میں اس وقت بالکل ننگی ہوں، بالکل ننگی ہوں، لیکن تم سے زیادہ نیک ہوں، تم سے زیادہ پاک ہوں!

میرے دل میں ابھی تک اپنے خاوند کیلئے پیار ہے، اپنے بچوں کیلئے سینے میں محبت کا سمندر موجزن ہے، تم نے ماں کی مامتا کے بھی دو ٹکڑے کر دیئے، تم نے میری روح اور جسم، دونوں کو زنگ لگا دیا، یہ سفر جو پاکستان سے شروع ہوا۔ اور ہندوستان میں ختم ہوا۔ کتنا بھیانک اور المناک سفر تھا۔ اور اُسے آج پہلی بار محسوس ہوا۔ کہ ان دو مملکتوں میں بسنے والے لوگ کتنے حقیر اور کمینے ہیں، اُنکے دل کتنے چھوٹے ہیں، انکی زندگی کا دائرہ کتنا محدود ہے، اور یہ زندگی کتنی جھوٹی، فضول اور نکمی دکھائی دیتی ہے، لوگ کہتے ہیں، کہ جو لوگ میرے ساتھ سوئے تھے، وہ غنڈے تھے، لیکن سوہن لعل کو کس نام سے پکاروگے، میری ساس کو کس لسٹ میں جگہ دوگے اور اسطرح اُن تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کو کیا کہوگے، جو اپنی لڑکیوں کو صرف اسلئے گھروں سے نکال دیتے ہیں، کہ تم مسلمان کے پاس سوئی ہو، اور تم ہندو کے پاس سوئی ہو، تم جو شرافت، تہذیب اور تمدن کا لباس پہنکر مجھے گھر سے باہر نکال دیتے ہو، تمھیں کس نام سے پکارا جائے، تم نے صرف میرے جسم سے زنا نہیں کیا بلکہ میری روح سے بھی زنا کیا ہے، تم نے میری روح اور جسم دونوں کو کچلا ہے، مارا ہے، تم عجیب انسان ہو، کبھی ہندو کے بھیس، کبھی مسلمان کے بھیس میں اور کبھی سکھ کا بھیس بدلکر، عورتوں پر نئے نئے ظلم و ستم کرتے ہو۔

وہ سوچتی جاتی تھی، اور رات اور گہری ہوتی جاتی تھی، سناٹا اور بڑھتا جاتا تھا، اندھیرے میں اور سیاہی آتی جاتی تھی، چاند اور ستاروں کی روشنی میں نفاست اور بانکپن آرہا تھا، املی کا درخت اُسی طرح کھڑا تھا، اکیلا، تنہا، بے یار و مددگار۔ اور گھپ اندھیرے کے لبادے کو اوڑھ کر، اپنے دل کی گہرائیوں کو ٹٹول رہی تھی، کبھی

کبھی املی کے ایک دو سُوکھے پتّے زمین پر گر پڑتے،۔ اور ہلکی سی آواز پیدا کرتے اور نہایت خاموشی سے زمین پر لیٹ جاتے،۔ یا جب کبھی ہوا تیز چلتی، تو کوئی پرندہ اپنے پروں کو پھڑپھڑا کر پھر اپنے گرد سمیٹ لیتا،۔ تو وہ ایک لمحہ کیلئے چونک اُٹھتی،۔

وہ سوچ رہی تھی، کہ اُسکے ذہن میں اُن لمحات کی بجلی کوندی، جب اُسے انسان کے نیک ہونے کا ثبوت ملا، حکیم صاحب کا اُنکے ہاں جان دینا،۔ صفدر کا اُسے گھر پہنچانا،۔ اور اُسکا سُسر،۔ وہ بھی کتنا نیک اور شریف تھا، اگر آج وہ زندہ ہوتے، تو اُسکی یہ حالت نہ ہوتی،۔ اور جب وہ گھر سے نکلی تھی، تو اُسکے دونوں بچّے اُسے ماں۔ ماں پکارتے ہوئے اُسکے سینے کے ساتھ چمٹ گئے تھے، اور اُسکی ظالم ساس نے اُسکے دونوں بچّوں کو زبردستی اُس سے چھین لیا تھا،۔ بچّے روتے رہے اور وہ مکان سے باہر چلی آئی،۔ اکیلی،۔ ہاں وہ اکیلی آئی تھی،۔ کیا وہ اب بھی اکیلی تھی،۔ کیا اس سفر میں کسی نے اُسکا ساتھ دیا تھا۔۔ ہاں۔ ہاں دیا تھا۔ حکیم صاحب نے ساتھ دیا تھا، اُسکے سُسر نے ساتھ دیا تھا، اور صفدر نے ساتھ دیا تھا۔ اور اُسکے دو بچّوں نے ہاں۔ ہاں، وہ زندہ رہیگی،۔ وہ ان لوگوں کو ساتھ لیکر اس دنیا میں نکلے گی،۔ دیکھو دیکھو۔ یہ انسان ہیں،۔ یہ انسان ہیں،۔ یہ نئی تہذیب کے ستون ہیں،۔ وہ نہیں مریگی وہ ایک نئی زندگی کا آغاز کریگی،۔ وہ اپنے خون،۔ اپنے سینے،۔ اپنی یادوں کی گہرائیوں سے اس خونی ماضی کو نوچ نوچ کر پھینک دے گی،۔

~~~

اب وہ نہیں مریگی، وہ خودکشی نہیں کریگی،۔ وہ ان لوگوں کو لے کر آگے بڑھے گی،۔ صفدر،۔ حکیم صاحب،۔ اُسکا سُسر،۔ اُسکے بچّے۔ دراصل یہی
~~~

انسان کہلائے جا سکتے ہیں،۔اب ان لوگوں کی تعداد بڑھے گی،۔یہ لوگ مرے نہیں، زندہ ہیں،۔یہ لوگ دونوں ملکوں میں ہیں،۔انکی تعداد دن بدن بڑھیگی، ۔ ہاں۔ہاں۔وہ خود لوگوں کو بتائیگی،۔کہ ہندو اور مسلمان کی تفریق کتنی ذلیل ہے یہ انسان کو حیوان بنا دیتی ہے،——اس خیال کے آتے ہی اُسکا جی خوش ہوگیا،۔جیسے بیٹھے بٹھائے اُسے خزانہ مل گیا ہو۔۔وہ رات یہاں بسر کریگی، اور صبح ہوتے ہی زندگی کا سفر شروع کریگی،وہ چُپ چاپ درخت کے تنے کے ساتھ چمٹ گئی،۔۔دُور آکاش پر چاند مُسکرایا،اور ستارے کھلکھلا کر ہنس پڑے،۔درخت پر کسی پرندے نے اپنے پر پھڑ پھڑائے،اور پھر پروں کو اکٹھا کرلیا،۔اور اندھیرا مُنھ پھاڑے اِس باہمت عورت کی طرف مری ہوئی نگاہ سے دیکھ رہا تھا،—اور پُشپا کے دل میں یکایک یہ خیال آیا۔کہ اُسکا خاوند کب کا مرچکا،اب سوہن اُسکے لئے کچھ نہ تھا،۔ایک بیکار۔ایک ناکارہ چیز،— اُسکی ساس مرچکی تھی،—وہ غنڈے مرچکے تھے،۔ہاں،۔اُس نے کبھی شادی نہیں کی،۔وہ بالکل باعصمت ہے،کسی شخص نے اُسکی عصمت نہیں چھینی،۔کوئی شخص اُس کی عصمت نہیں چھین سکتا،۔وہ بالکل کنواری ہے،۔ایک شگفتہ کلی،—— صبح کی طرح پاک اور صاف،————————...

Scanned by CamScanner